



17/3/30

مرتبة

فنان فحيم

قواعد رسالہ نگار

- ۱- رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے۔
- ۲- رسالہ نہ پونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا۔
- ۳- خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے۔ چنانچہ نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔
- ۴- جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
- ۵- مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئے۔
- ۶- سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ، سہ ماہی دو روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

نرخ نامہ اجرت اشتہارات

تقدیر صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پانچ صفحہ
بزرگ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھوٹا مرتبہ	۶۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
تقدیر صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پانچ صفحہ
تین مرتبہ	۲۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصد کمییشن دیا جائیگا میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

نگار ایک کنسی لکھنو

مولانا نذیر احمد

بنات انفس ۸
مراۃ العروس ۱۰
توبۃ النصوح ۱۰
موقف حسنہ ۸
روایۃ صداقہ ۸
ایامی ۸
فساد قبلہ ۸
ابن الوقت ۸
مصاب قدر ۱۳

مولانا شبلی

سیرۃ ابنی جلد اول ۸
دوم ۸
سوم ۸
الفاروق ۸
سیرۃ النعمان ۸
الغزالی ۸
المأمون ۸
سوانح مولانا روم ۸
سفر نامہ شام ۸

علم الکلام ۸
الکلام ۸
رسائل شبلی ۸
مقالات شبلی ۸
شعر العجم جلد اول ۱۲
دوم ۸
سوم ۸
چہارم ۸
پنجم ۸
موازنہ نہیں دیر ۸

مضامین غالبگیر ۱۲
آغاز اسلام ۱۲
کلیات فارسی شبلی ۸
کلام شبلی اردو ۸
امیر مینائی ۸
صنم غاۃ عشق ۸
مراۃ الیب ۸
محامد خاتم النبیین ۸
میناس سخن ۸
مکاتیب امیر مینائی ۸

رتن ناتھ سرشار ۸
سیر کسار ۸
خدائی فوجدار ۸
جام سرشار ۸
الف لیلة بطرزا ناول ۸
کامنی ۸
سوانح عمر و عیار ۸
منشی سجاد حسین ۸
احسن الذی ۸
عاجی بغلول ۸

پیری دنیا ۸
کالی پلٹ ۸
میٹھی چھری ۶
طرح دار لونڈی ۸
طلسمی فانوس ۸
جوالہ شاد برون ۸
مرزائی ۸
مار استین ۸
بنگالی دولہن ۱۳
ممشو و فرنگ ۸

بسم اللہ

نگار

فہرست مضامین ماہ مارچ ۱۹۳۰ء

ملاحظات	۲	باب الاستفسار	۸۶
شیخ محمد حزمین - عبدالملک آر دی	۹	محبت کا ایک لمحہ (نظم) حافظ غازی پوری	۹۲
مصور کا ناتمام شاہکار (فسانہ) ظفر قریشی دہلوی	۳۸	پیام (نظم) جمیل منٹری کاظمی	۹۳
کیا مسلمانوں کے عقاید اسلامی ہیں - سید مقبول احمد بی بی	۴۳	میموریل گارڈن کلکتہ (نظم) اختر شیرانی	۹۴
مراق (فسانہ) رفیعہ اجیری	۴۸	غزلیات :-	
مومن و کلام مومن - کیفی چریا کوٹ	۵۷	افسر امر دہلوی	۹۵
انتظار (فسانہ) محشر عابدی	۶۵	نظیر لودھیانوی، ثاقب جالندھری	۷۷
حکومت برطانیہ کی وسعت کاراز - عبدالقیوم رسا	۷۴	رباعیات :- فراق گورکھ پوری	۹۶

بسم اللہ

دنگار

ادیٹر: نیاز فتحپوری

شمار (۳)

مارچ ۱۹۳۰ء

جلد (۱۷)

ملاحظات

خدا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب سورج کے طلوع و غروب سے مانگو چاند کے ایاب و ذہاب سے پوچھو، آبشاروں کی روانی دشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو، پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔ موسموں کا باقاعدہ تغیر و تبدل بہار و خزاں کا ظہور و خفا نباتات کی بوقلمونی، وحوش و طیور کی طبعی نیرنگی، نوع انسانی کے توانے کا منہ، فضا کے بسیط کے ستارے کائنات کی لامناہیت و وسعت، خور و شبینم، ذرہ و آفتاب اور ان سے بھی فروتر انسانی مساعی کی مختلف صورتیں، رجن کا نام ہم نے علم طبقات الارض، علم الجو، علم الافلاک، علم الکیما، علم وظائف الاعضاء، علم الحیات، نفسیات و غیرہ رکھا ہے۔ بتائیں گی کہ کوئی ایسی قوت ہے جس کے سمجھنے کے لئے ہم اپنی عقل کو عاجز و بے بس پاتے ہیں اور اسی لئے یہ مسئلہ اس قدر بدیہی اس درجہ روشن و واضح ہے کہ اگر چاہوں تو اسے مشاہدہ سے تعبیر کر سکتا ہوں جس کے لئے نہ دلیل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی حجت و توجیہ کی۔ آفتاب طلوع ہوتا ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے آگاہ ہو جاتا ہے، صبح کو پھول کھلتے ہیں اور سارا کونج نکلتا ہے معمور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو آپ اپنی برہان ہے، یہ وہ صداقت ہے جو آپ اپنی مصدق ہے۔ اگر ہم اس سے ناواقف ہیں تو کس کا قصور؟

حق خامش است و باتو بصد رنگ گفتگو است شوق آرمیدہ است و فلک تازہ جستجو است
موقوف اضطراب زمان نیست عرض راز گرداری اشارہ تحقیق موبہو است
ہر گہ نظر خطاب کند حرف خامشی است ہر جا بہار ساز شود نغمہ رنگ و بو است
کثرت حجاب جلوہ وحدت نمی شود مژگان بہر چہ باز کنی دیدہ محو است

پھر اب اور نہ کبھی، یہ سوال تو پیدا ہی نہیں ہوا کہ کوئی قوت مافوق الادراک ہے یا نہیں البتہ عقول انسانی کا اختلا
اس امر میں ضرور ہوا ہے کہ ہم اس کا تصور کیونکر کریں، اُس نہ دیکھے جا سکتے وائے کو کیونکر دیکھیں اور اُس نہ سمجھے جا سکتے
وائے کو کس طرح سمجھیں فلسفہ آج تک اس گروہ کو نہ کھول سکا اور مذہب کی عقدہ کشائیں تمام تر اسی ایک سے وابستہ رہیں
اور مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء و رسل نے مختلف طریقوں سے اسی مسئلہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، لیکن کیا یہ امر حیرتناک
نہیں ہے کہ باوجود اس کے کہ حقیقت ایک ہے، مگر تعبیرات بشمار، راز ایک ہے مگر اس کی داستانیں کثیر، اور

حُسنک واحد و عیار اثنا شتی

جنگ ہفتاد و دو ملت ہم را عذر نہ چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند
مذہب و نژاد، اقوام و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ کفر و اسلام، اذان و ناقوس کی وہ جنگ جو آج
نظر آرہی ہے، کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اس کی ابتدا اُسی وقت سے ہوتی ہے جب سے انسان اپنی فطرت کے ساتھ جذبہ تفوق پرستی
لیکر آیا ہے، یقیناً یہ جنگ علم و مذہب کی جنگ نہیں، کیونکہ اگر مذہب کا مقصود اعلیٰ صرف خدا شناسی ہے تو پھر مجھے کوئی سمجھا
کہ دنیا کا وہ کونسا علم ہے، جو معنا اس غایت تک نہیں پہنچتا، نہیں، بلکہ یہ جنگ اُن رقیبوں کی تھی جو ایک ہی محبوب کے
جلوہ کے لئے بیتاب تھے، اُن جانداروں کا خود فراموش کی تھی جو سوائے اپنے کسی اور کو ”خلوتیان راز“ میں شامل دیکھنا پسند
نہ کرتے تھے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہئے کہ وہ اپنے ہی ”ذوقِ سجود“ کے تفوق کو ثابت کر کے آستانِ محبوب کو اپنے لئے مخصوص
کر لینا چاہتے تھے۔ یقیناً یہ کمزوری کم و بیش ہر زمانہ کے انسان میں پائی گئی ہے اور آج بھی تمام افتراق و انشقاق اسی کمزوری
کا نتیجہ ہے

فلسفہ و استدلال کی دنیا میں اگر جس وقت اس مسئلہ پر غور کیا جائیگا تو معلوم ہوگا کہ اس کا اصل سبب صرف
یہ ہے کہ خدا کے جس تصور کو مذہب عالم نے پیش کیا وہ صحیح نہ تھا ممکن ہے کہ صرف قومی و ملکی نظام تمدن کے لحاظ سے اُس وقت
مناسب رہا ہو لیکن اخوت عامہ اور ہمہ گیری کے لحاظ سے وہ نامکمل تھا، دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ایسا ہوا ہے
جس نے ہزاروں لاکھوں سال کی اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھا یا اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اب نہ مذہب کے لحاظ سے کسی اور مذہب
کی ضرورت دنیا کو باقی ہے نہ مبلغ مذہب کی حیثیت سے کسی اور ہستی کے رونما ہونے کی حاجت۔ اور وہ مذہب اسلام ہے
جو نہ کسی ملک کے لئے مخصوص ہے نہ کسی قوم کے لئے مختص، اس کی دعوت گہر و ترسا، یہود و نصاریٰ، عالم و جاہل، امیر و فقیر

شاہ دگدگ مشرق و مغرب، شمال و جنوب ہر طبقہ و ہر ملک کے لئے یکساں ہے اور اسی لئے اس نے جو مفہوم خدا کی کبریائی کا پیش کیا ہے وہ ایسا جامع، ایسا قرین عقل، ایسا ہمہ گیر اور سدرجہ وسیع ہے کہ جس آسانی سے ایک جاہل اُسے قبول کر سکتا ہے بالکل اسی طرح ایک فلسفی بھی اس کے ماننے پر مجبور ہے۔

وہ زمانہ جب آسمانی بادشاہت کا وعظ دیکر خدا کو ایک دنیاوی صاحب جبروت بادشاہ کی طرح پیش کیا جاتا تھا، ختم ہو گیا، وہ عہد جب عقول انسانی صرف مرئی و محسوس اشیا پر ایمان لاسکتے تھے اور جب ضرورتاً و مصلحتاً مسیح کو خدا کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تھی، گزر گیا، وہ دور انسانیت جب تمرکز نفس (egoism) کے لئے رمز و اشاری (symbol) طریق عبادت کی ضرورت محسوس کر کے خدا کے وجود کو بتوں، ہیكلوں، مثالوں اور مجسموں میں تبدیل کیا گیا، باقی نہیں ہے۔ یہ تمام زمانے اب سے تقریباً ۱۳۵۰ سال قبل ختم ہو گئے، جب ریگستان عرب سے ایک انسان کامل و اکمل کا ظہور ہوا اور اس نے نہایت ہی مختصر و سادہ الفاظ میں خدا کے وجود کا وہ فلسفہ بیان کیا جو اس سے قبل کسی نے بیان نہ کیا تھا۔ اسے ثنویت و تثلیث کی تردید کی، اسے تجسیم و تشکیل کو غلط ٹھہرایا اسے حلول و تغلیط کی، اسے تشتت و انتشار کی صورتوں کو محو کیا، تفریق و افتراق کی راہوں کو بند کیا اور اسے بتایا کہ خدا تمام مکانات و زمانیات کے تعلق سے بے نیاز ہے، مادیات کی دنیا سے علیحدہ ہے اور تمام ان نسبتوں و اضافتوں سے منزہ جو عقول انسانی کو کسی وجود کے سمجھانے کے لئے متعین کیجاتی ہیں۔

ایک طرف تو اسے بتایا کہ اس کا قیام عرش برین پر ہے یعنی ذات انسانی سے علیحدہ کائنات میں، فضائے وسیع میں، جولا تنہا ہی میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا ہے اور اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور دوسری طرف اسکو شہ رگ سے زیادہ قریب بتایا یعنی جس حد تک ذات انسانی کا تعلق ہے، اُس کے قریب کی کوئی انتہا نہیں وہ سانس میں جاری ہے، خون میں ساری ہے، روح میں دوڑ رہا ہے، قلب میں جاگزیں ہے۔

اس کو رحمان و رحیم بتایا، اور جبار و قہار ظاہر کیا یہ ظاہر یہ نام ایک دوسرے کی ضد ہیں، لیکن دین سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جن کو اسماء حسنی کہا جاتا ہے وہ نہ خدا کے ذاتی نام ہیں نہ صفاتی بلکہ آثار سی و مظاہری اسماء دین جن کا تعلق کائنات کے ہر تغیر و تبدل، زندگی کے تمام اصول اور ہستی کے جملہ اعتبارات و امتیازات سے ہے۔ یعنی اگر انسان خوشحال و پُر امن زندگی بسر کر رہا ہے تو یہ بھی اُسی کا مظہر ہے، اور اگر فقر و جبر کی ساعتیں گزار رہا ہے تو بھی یہ اُسی ایکشات کی وجہ سے ہیں، جس نے اسباب و علل کو پیدا کر کے عالم کی تمام کیفیات مادی و ذہنی کو اپنے سے منسوب کیا ہے اور جن کے اختیار کرنے اور انھیں کے مطابق نتائج حاصل کرنے کے لئے انسان کو عقل کامل عطا فرمائی ہے۔

یہ تھا خدا کا وہ تصور جو بانی اسلام نے بتایا اور دعویٰ کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے زیادہ پاکیزہ و منزہ خیال جو بالغ ترین نگاہ اور رساترین فکر انسانی کے لئے بھی قابل قبول ہو، اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہی ہے وہ اصل اصول مذہب

جو انسان کو وسیع النظر بناتا ہے جو تمام افراد کو ایک رشتہ اخوت سے وابستہ کرتا ہے اور جو دلوں کو تعصب و جہل، کینہ و بغض سے پاک کرتا ہے، لیکن کیا کوئی مسلمان آج کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا کو ایسا ہی سمجھ رہا ہے جیسا بانی اسلام نے سمجھا یا تھا اور اس کی آغوش ہر انسان کے لئے خواہ وہ کسی مذہب و ملت، کسی ملک و قوم کا ہو پوری طرح کھلی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ طبقہ و صوبہ بھی جن کے مشرب و مسلک کا انحصار ہی عقیدہ ”وحدت وجود“ پر ہے کوئی کیفیت اپنے ذہن و ضمیر میں اس نوع کی نہیں پاتے جو اس اعتقاد کے بعد پیدا ہونی چاہئے

ہمارے یہاں کے علماء مقدس جو اپنی ساری زندگی صرف روزہ و نماز کی تلقین میں بسر کر دیتے ہیں کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی غور نہیں کرتے کہ جس خدا کا پیام وہ دنیا کو پہنچا رہے ہیں وہ پہلے روزہ و نماز کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس تعلق کی تصدیق چاہتا ہے جو اس کے اور بندوں کے درمیان قائم ہے اور جس کے سمجھنے پر کائنات کی ترقی، روح کا استعلاء، اخلاق کی پاکیزگی، مادی ارتقاء اور عالم کا امن و سکون منحصر ہے۔ اگر ایک مسلمان نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے یہ خیال لیکر نکلتا ہے کہ مندر و کلیسا خدا کی حکومت سے غلطی رہے، اگر وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر اپنے سوا تمام عالم کو غیر خدا کی پیداوار جانتا ہے تو، مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم!

پھر جب خدا سب کا ہے، تمام مخلوق اسی کی ہے، اس کو نہ مذہب سے فائدہ پہنچتا ہے نہ لاندہ بیت سے نقصان تو پھر یہ عصبیت کیوں، یہ تفوق و برتری کا غلط معیار کیسا، طریق عبادت کے اختلاف پر جنگ کیا معنی، وضع و لباس کی تفریق، تمدن و معاشرت کے امتیاز پر آویزش کیسی؟

دل چو آزاد از تعلق شد منور می شود قطرہ گز موج دامن چید گوہر می شود
ہیچکس را در محبت شرم ہیچشمی مبار در ہواست ہر کہ گریہ و دیدہ ام تری می شود

”انسانیت، اب نہیں بلکہ ایام طفولت ہی سے حسن و جمال کا خواب دیکھ رہی ہے، اور جس حد تک اس کا علم، اس کے مشاعر بڑھتے جاتے ہیں، اس قدر زیادہ شدت و تنوع کے ساتھ یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک صاحب فن اپنے فن میں، ایک شاعر اپنے شعر میں، ایک ادیب اپنی انشاء میں، ایک فیلسوف اپنے فلسفہ میں یہاں تک کہ ایک مادہ پرست بھی (جو اپنی فطرت کے لحاظ سے معنی جمال سمجھنے کا بہت زیادہ نااہل ہے) حسن ہی کا خواب دیکھتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جمال کسے کہتے ہیں؟

جمال ایک خیال ہے جو مادہ کے ملبوس میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ ایک تبسم ہے جو عالم انسانیت کی پیشانی پر نمودار ہوتا ہے۔ وہ صحراء حیات میں تھک جانے والے تمدن کی جائے پناہ ہے۔ وہ ایک قوت ہے جو مادہ کی قیود سے رہن آزاد کرتی ہے۔ وہ حیات سے زیادہ ترقی یافتہ چیز ہے جو حیات کو بھی بھلا دیتی ہے۔

ہاں اپنی لڑکی کے سنہرے بالوں کے چھلون کو دیکھ کر فطرت سے مسکرا پڑتی ہے اور لڑکی بھی ہنس دیتی ہے شاعر دیکھتا ہے اور ان دونوں کی ہنسی میں وہ جمال الہی کی چمک محسوس کرتا ہے۔ ایک نوجوان اپنی محبوبہ کے چہرہ پر نگاہ ڈال کر اپنے قلب کو سکون سے بھر لیتا ہے۔ ایک شخص شام کے وقت آسمان کی رنگین فضا کو دیکھ کر، آفتاب کو افاقہ لاتی ہوئی میں غروب ہوتے ہوئے دیکھ کر جمال فطرت سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک شاعر، ایک مغنی حسن سے متاثر ہو کر اپنی موسیقی کے بازوؤں سے فضا میں اس تاثر کو پھیلا دیتا ہے، پھر اگر اس کا نغمہ عظمت و طن سے متعلق ہے تو وہ اپنے نفس کو وطن کے ہیکل مقدس پر قربان کرتا ہوا محسوس کرتا ہے اور اگر وہ نغمہ محبت ہے تو ہر آواز کے ساتھ وہ اپنی روح کے اجزاء کو صرف ہوتے ہوئے دیکھتا ہے

تاردر (Tard) اپنی کتاب ”النطق الاجتماعي“ (Le langage social) میں کہتا ہے۔ ”ہم وطن کو جمیل کہتے ہیں جب وہ قوی ہوتا ہے۔ ہم اسے عظیم کہتے ہیں جب اس کے افراد مہذب و شایستہ ہوتے ہیں“۔ یقیناً جمیل ہے وہ وطن جو ظلم کے سامنے نہیں جھکتا اور جو لوہاء حضارت بلند کرنا اپنا نصب العین قرار دیتا ہے

اسپارٹا حسین تھا، جب اسپارٹا کا رہنے والا دیکھتا تھا کہ اس کا ملک بلاد یونان پر حکمران ہے۔ مصر قدیم جمیل تھا جب اہل مصر اپنے ملک کی عظمت کے معتقد تھے اور وہاں کے ہیکل و آثار میں وہ انوار ربانی کی روشنی کو مرکوز پاتے تھے۔ روم جمیل تھا جب مانی اپنی مملکت کو تمام بلاد عالم کی ملکہ جانتا تھا۔ بلاد عرب جمیل تھے جب اسلام اس کے فرزندوں کو حضارت و مدنیت سے آراستہ کر رہا تھا اور اسکی شوکت و جبروت کی داستانیں دنیا کے ہر گوشہ میں سنی جاتی تھیں یہ خیالات تھے ایک مصری ادیب کے جن میں رات میں بھوٹا مینی سوچا کہ سرزمین ہند بھی جمیل تھی جب کبشن کی تعلیم نے صحیح معنی میں حریت و آزادی کی روح گوشہ گوشہ میں پھونک رکھی تھی۔ لیکن اب وہی سرزمین مشرق جو ہمیشہ سے طلوع حق و صداقت اور ظہور تہذیب و مدنیت کے لئے مشہور تھی، سوگوار ہے، کیونکہ اس کا جمال محو ہو گیا ہے، اس کی عظمت مٹ چکی ہے۔ اور غالباً اس سے زیادہ دردناک داستان اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یہ تمام سوگوار یاں خود فرزند ان ملک کے ہاتھوں اس کو حاصل ہوئی ہیں۔ کیا ہندوستان کی تاریخ غلامی سوائے اس بد بختی کے کسی اور چیز کی تاریخ ہے، کیا فرزند ان آریہ ورت کہہ سکتے ہیں کہ ان میں وہی غیرت و جہیت، وہی بلند خیالی، عالی نظری پائی جاتی ہے، جو ان کے اکابر و اعظم میں پائی جاتی تھی۔ آج ہندوستان کی آبادی کا عنصر غالب غیر کی حکومت سے آزاد ہونے کے لئے بیتاب ہے، لیکن کبھی اسے اس پر بھی غور کیا ہے کہ وہ خود اپنے برادران وطن کے ساتھ کس سلوک و رواداری کو جائز رکھتا ہے۔ ہندوستان کے لئے آزادی اور سوراج کے طلبکار حکومت موجودہ سے اپنے فطری و ملکی حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں، لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے ملک کی اس آبادی کے جذبات کا خیال نہیں کرتے جس کے ضعیف شانوں کی مدد حاصل کے بغیر یہ بار آسانی سے نہیں اٹھ سکتا

آج ہندو جماعت مسلمانوں کی عصبیت و تنگ نظری کی شاکی نظر آتی ہے، لیکن کیا واقعات اور عملی زندگی کے

تجربات جن کا مشاہدہ روز بروز ہوتا رہتا ہے، اس حقیقت کو ملحوظ کر دینا کہ جو جماعت ہم سے فراخ دلی اور رواداری چاہتی ہے وہ خود ہمارے لئے کس درجہ مُکلف، تنگ نظر اور متعصب ثابت ہو رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس جماعت کے قاید و رہنما بھی اس مرض میں مبتلا ہیں، لیکن یہ الزام ان سے کبھی رفع نہیں ہو سکتا کہ باوجود اس علم کے انھوں نے کبھی اپنے ملک کو صحیح معنی میں اس نقص کے رفع کرنے پر آمادہ نہیں کیا۔

ملک کی آزادی نہ گول میز کانفرنس سے مل سکتی ہے، نہ سول نافرمانی سے، بلکہ وہ میسر آ سکتی ہے صرف اتحاد و اتفاق سے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب چھوٹی جماعتوں کے دلون سے تمام اندیشے نکال دیئے جائیں۔ نہرو رپورٹ خواہ کتنی ہی مناسب کیون نہ رہی ہو اور اب آزادی کا اعلان خواہ کتنا ہی دلنخوش کن کیون نہ ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے دل خطرات سے بسر نہ ہیں اور عملی زندگی کے تجربات نے ان کو ہندوؤں کی طرف سے سخت بدظن و بددل کر رکھا ہے اگر آج گاندھی اور نہرو نہایت فراخ دلی سے اس امر کا اعلان کر دیں کہ وہ مسلمانوں کی تمام شکایات سننے اور ان کے مداوا کے لئے طیارہ بن تو ابھی یہ دور متدبذد دور ہو جاتا ہے اور منزل مقصود قریب۔ لیکن ہم کو معلوم ہے کہ یہ نہیں ہو گا اور حصول آزادی کے بعد ایک نہایت ہی المناک قسم کی اندرونی جنگ شروع ہوگی اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ اس اخلال کا نتیجہ کیا ہو یقیناً ہندوؤں کی جماعت کثیر ہے، صاحب دولت ہے۔ صاحب علم ہے، اور ان کے مقابلہ میں مسلمان کم ہیں ضعیف و غریب ہیں، جاہل و بد نصیب ہیں، لیکن یہ حقیقت بھی غالباً ہندوؤں سے مخفی نہ ہوگی کہ ہر چیز کی ایک حد ہو کرتی ہے اور مجبوری کے عالم میں انسان بھی کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

گاندھی نے حکومت کو اعلان جنگ دیدیا ہے اور ملک کو آمادہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے سینوں کو حکومت کی تیغ و تفتنگ سے زخمی ہونے کے لئے کھول دے اور اس میں شک نہیں کہ یہ وہ طریق کار ہے کہ اگر سارا ملک اس پر آمادہ ہو جائے تو دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ مسلمان بہت کم اس میں حصہ لین گئے اور ہندو بھی کوئی ایسا محاذ قائم نہ کر سکیں گے جس کی کمزوری سے مخالف فائدہ نہ اٹھا سکے۔

ماہ گزشتہ کے نگار میں اپنے سفر حیدرآباد کا اعلان کرنے کے بعد حضرت ہوش بلگرامی کا تادم وصول ہوا کہ رمضان کے بعد آنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ زمانہ دہان عام تعطیل کا ہوتا ہے اس لئے میرے سفر کی خبر تو مشتہر ہو گئی اور میں یسین مارچ مجھے اپنے اُن احباب سے سخت ندامت ہے جنھوں نے مجھے ناگپور، پلہار شاہ اور دوسرے مقامات پر ریل میں ڈھونڈنے کی حرکت گوارا فرمائی۔ یقیناً یہ میری غلطی تھی، لیکن شاید ایسی ہولناک قسم کی نہیں کہ اس کو نظر انداز نہ کیا جاسکے۔ بہر حال اب مارچ کے دوسرے ہفتہ میں روانہ ہونے کا قصد ہے، لیکن تعین تاریخ نہ کروں گا، کیونکہ بالکل ممکن ہے اب ہوش صاحب مجھے ”قلو ما ینزلکم“ کہہ کر روک دیں، فردوس میں جگہ پانے کے لئے رضوان کے ناز اٹھانا ہی پڑتے ہیں اور اٹھاؤنگا جب تک ”ہوس نشاط“ کا

سودا سرین موجود ہے۔

اس ماہ کے مضامین میں پہلا مضمون مولوی عبد المالك آروى کا حزمین پر ہے جو ختم ہو گیا۔ اس مضمون کے دو حصے تھے ایک تاریخی دوسرا تنقیدی۔ تاریخی حصہ کے متعلق فاضل مقالہ نگار نے جو کاوش کی ہے وہ کسی طرح نظر انداز نہیں ہو سکتی تنقیدی حصہ البتہ تشنہ رہا اور اس سے کہیں زیادہ استقصاء کا مستحق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب عبد المالك صاحب وجود اپنے مشاغل معاش کی کثرت کے جتنا وقت مطالعہ و تحریر پر صرف کر دیتے ہیں وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ کاش زمانہ انھیں فرصت دیتا اور وہ اپنے ذوق و ولولہ کے لحاظ سے زبان کی خدمت انجام دے سکتے۔

ظفر قریشی کے فسانہ میں کوئی خاص بات سوائے اس کے نہیں کہ ”تبعیر نقش“ کو اچھے پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ جناب رفیع کا انسانہ جو مراق کے عنوان سے لکھا گیا ہے، یہ عجیب خصوصیت رکھتا ہے کہ اس کے لکھنے والے پر واقعی مراق کا دھوکا ہوتا ہے اور پڑھنے والا بھی اپنی جگہ سوچنے لگتا ہے کہ کہیں وہ تو اس مرض میں مبتلا نہیں ہو گیا فسانہ نگاری کا ایک خاص اسکول ہے جو فسانہ کی تمام کیفیات کو اپنے اوپر طاری کر کے ناظرین کو بھی اس سے متاثر کرنا چاہتا ہے اور جناب رفیع نے اسی اسکول کے تتبع میں یہ فسانہ لکھا ہے۔ لیکن اگر اس کے علاوہ فسانہ نگار کا مقصود اس سے محبت کے فلسفہ پر بحث کرنا ہے تو مجھے اس کی صداقت سے انکار ہے۔ اور اس باب میں مجھے اُن کے اس دوست سے اتفاق ہے جو محبت کے مفہوم کو اسی عالم گوشت و پوست سے متعلق کرتا ہے۔ یہ عشق اور وحدت الوجود کا اجتماع کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اجمیر کی فضا میں پرورش پانے والے دلغ ممکن ہے اس مغالطہ سے اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکیں

مومن و کلام مومن کا سلسلہ پھر شروع کیا گیا ہے جس کے دلچسپی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ جناب محشر عابدی کا فسانہ ”انتظار“ خوب ہے۔ میں ہارڈی کی تعریف کیوں کروں، اسی کو کیوں نہ دادوں جس نے اس خوبی سے اُسے اردو میں منتقل کیا اور نگار کو بغرض اشاعت روانہ کیا۔ اور اگر اس نوع کے المناک فسانہ لکھنا کوئی عیب ہے تو اس کے ذمہ دار مجنون گورکھپوری ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اپنے افسانوں کے لئے ہارڈی کا انتخاب کر کے اس بدعت کو عام کیا۔

سلطنت برطانیہ کے متعلق جو مضمون درج ہے وہ بالکل وقت و موسم کی چیز ہے اور موجودہ حالات کے ماتحت اُسے حد درجہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جانا چاہئے

ہمارے دوست سید مقبول احمد صاحب بی اے کا مضمون مسلمانوں کے عقاید کے متعلق حقیقتاً تمہید ہے ایک اور مضمون کی جو اس کے بعد شائع ہونے والا ہے نظم و نثر میں حافظ غازی پوری کی نظم اچھی تخیل کا نمونہ ہے۔ اور آخر شیرانی نے جو کچھ لکھا ہے وہ حد درجہ ایمان انگیز نکات پر مبنی ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ خدا جو ان کرے لیکن جو انی کا احساس نہ پیدا ہونے دے۔

نیاز

شیخ محمد بن ابوطالب علی حنین لاہی

(بہ سلسلہ سابق)

حنین کی شاعری پر تقدیر کا اثر

شیخ کے محاسن کلام، اور ندرت فکر کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان عناصر کی تحقیق کر لجائے، جو شیخ کی ارتقاءے تکمیل میں موید ہوئے، طریق جستجو کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، تاریخی روایات یا خود شیخ کے کلام کا گہرا مطالعہ، پہلی صورت آسان ہے لیکن اس میں شیدائے تحقیق کو لذت خود اعتمادی میسر نہیں آتی اور دوسری صورت مشکل ہے، لیکن کسی مسئلہ پر اجتہادی اور تحقیقی نظر ڈالنے والے افراد کے لئے نشاط باطن کا سبب ضرور ہے اور ارباب نظر کے نزدیک بھی یہ آخری طریقہ استنباط یقیناً قابل ستائش ہوتا ہے، گو جو یاے حق سے اجتہاد اور قیاس میں لغزشیں ہی کیوں نہ ہوئی ہوں، لہذا میں بجائے تاریخ کی ورق گردانی کرنے کے خود شیخ کے کلام پر ایک گہری نظر ڈال کر یہ جستجو کرنا چاہتا ہوں کہ شیخ نے فارسی شاعری کے کن مبادی سے استفادہ کیا، ہر مسلک کے رہرو کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ بدرقہ راہ یا نقش قدم کا جویان ہو، رینالڈ اے نکلسن نے مقدمہ دیوان شمس تبریز میں مولانا روم جیسے باکمال اور بلند پایہ شاعر کے محاسن افکار کی تفصیل کرتے ہوئے ان مبادی کا تذکرہ کیا ہے، جن سے مولانا مستفید ہوئے، اسی طرح عرفی جسکی آتش بیانی، سحر طرازی، اور زور بیان کے متعلق تفصیل سے لکھ چکا ہوں، تعلی اور اظہار کمال میں غلو کرنے کے باوجود تقدیر کا فیضان سے بہرہ اندوز ہوئے، لہذا شیخ حنین بھی اس فطری تقلید سے اعراض نہیں کر سکتے تھے،

شیخ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے، کہ وہ رومی، حافظ، سعدی، فغانی، نظیری اور سنائی سے بہت عقیدت رکھتے تھے، چنانچہ بعض غزلیں ایسی ہیں جنکے مقطع میں آپ نے اپنی عقیدت مندی کا اظہار بھی کر دیا ہے، جس غزل میں جس قدیم شاعر سے اپنے اظہار عقیدت کیا ہے، وہ ادا لے بیان، لطافت فکر، اور مماثلت ذوق کے اعتبار سے اس شاعر کے کلام سے ملجاتی ہے۔

مولانا رومی و حنین | شیخ ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں۔

حنین از عارف رومی صدائے عشرتِ زہدہ کہ سانی ہر چہ دریا بد تمام آورد مستانرا
اس غزل میں تمام و کمال رومی کا طرز بیان ہے، وہی جلوہ آئی ہے، وہی بے خودی اور ولولہ صوفیانہ فرماتے ہیں۔
ورید نہائے جیب غنچہ از باد سحر گاہ ہے برون از خرقة ناموس و نام آوردستانرا

لے نگار بابت الکتاب ”غالب بے نقاب کے حجابات“ لے نگار بابت دبیر شمسہ خواجہ سید محمد شیرازی

اسی طرح فروغ خلوت، عالم شہود اور رموز وصل کی یون پرودہ درمی کرتے ہیں
دو عالم خلوت یا راست مطرب پردہ سرکن سروش خاص او در بزم عام آورد مستانرا
ایک دوسری غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

(۲) برگش از دل نفس مولوی روم حسنین تاز گلزار و سمن رنج خزان برخیزند
یہاں بھی مولانا رومی ہی کی طرح علم حقیقت، اور تصوف کے مباحث پیش کئے ہیں فرماتے ہیں
یا تو در خلوت دل وصل مدامی خواہم کز میان کلفت روزان و شبان برخیزند

اسی خیال اور اسی رنگ میں مولانا رومی کی غزل کا ایک شعر یہ ہے
عمر ابد پیش من ہست زمان وصال زانکہ ننگبد در وہاں هیچ زمانی مرا
شیخ اپنی ایک اور غزل میں مولانا رومی کے متعلق فرماتے ہیں

(۳) این جواب غزل مرشد روم است کہ گفت من ہوئے تو خوشم نافہ تاتار گیر
اس غزل کے تمام اشعار کو رومی کے خیالات سے چندان نسبت نہیں البتہ معن رندانہ، لہجہ شکوہ، بے باکی ادا اور راز و نیاز میں
حافظ کے کلام سے مماثلت ہے، ملاحظہ ہو۔

من خرابایم اے شوق مرا یا رگیر نیکنامی تو رہ خانہ خسار گیر
غبنہ بن طرہ چہ انداختہ بر سر دوش کافر عشق تو مائیم تو ز نار گیر
گر بہ گستاخیم از سینہ صغیرے زدہ سر رحم فرما و باین مسرع گرفتار گیر
ایک مقام پر اور لکھتے ہیں

(۴) اشعار عشق و مستی ست اشعار عارف روم گفتار نیست لیکن گفتار می نماید
خواجہ حافظ شیرازی اور حنین کے افکار نے وہ اثر آفرینی نہیں کی، چنانچہ آپ کے بعد جتنے اکابر شعر اجامی، عرفی، صائب
حزین وغیرہ گزرے سبھوں کے کلام میں حافظ کی رنگینی ادا، اور بیانی خیال پائی جاتی ہے، مرزا غالب نے تو شاعری کے وہ تمام
نقوش و رموز پیش کر دئے جو خواجہ حافظ کا طغرائے امتیاز ہیں، اور جس سے غالب کے قبیل اردو کا دامن معرا تھا، شیخ حنین
کو خواجہ موصوف سے بھی ایک خاص عقیدت تھی، فرماتے ہیں
دلم از نغمہ حافظ بہ سماع است حنین در ہننا نخانہ عشرت صتمے خوش دارم

می بود نغمہ حافظ دلم از ہوشش حنین این نشانہ بخشد می شیراز مرا

دم حافظ برد از دل غم دیرینہ حنین اے صبا نکھتے از خاک رہ یا بسیار

می برد مصرعہ حافظ دلم از دست حنین تکیہ بر عہد گل و باد صبا نتوان کرد

تازہ کردی روش حافظ شیراز حنین کہ ز انفا س خوشش بوئے کسے می آید
حافظ اپنے ادائے بیان میں آپ ہی اپنی نظیر ہیں لیکن حنین نے جو ہم آہنگی اور تمثیل کی کوشش کی ہے، وہ بھی ناکام نہیں
رہی بلکہ مختلف اثرات کے اختلاط، اور افکار کی آمیزش نے حنین کو لطافت خیال اور غرا بت ادا کا ایک ایسا دلکش مجموعہ
بنادیا جسکی پذیرائی سے کوئی صاحب نظر اعراض نہیں کر سکتا، موازنہ سے یہ نظریہ ایک حد تک واضح ہو گا۔

حافظ

حنین

نکتہ روح فزا از دہن یار بگو
نامہ خوشنجر از عالم اسرار بیا

اے صبا نکتہ از لعل لب یار بیا
گرے تحفہ ز گنجینہ اسرار بیا

حافظ اور حنین دونوں کے یہاں صبا سے خطاب ہے، الفاظ ملتے جلتے ہیں معنی بالکل ایک ہیں، حنین کے یہاں ”لعل لب یار“ اور گنجینہ
اسرار“ ہے، جسے حافظ نے ”دہن یار“ اور ”عالم اسرار“ کے الفاظ میں پیش کیا ہے، اگر حنین کے بحر علمیہ کے تاریخی واقعات ہمارے
پاس موجود نہ ہوتے، تو ہم اسے یقیناً سرقہ کہہ دیتے، لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ حافظ کی اس غزل کا مطالعہ کرنے کے بعد شیخ صاحب کو اس رنگ
اور معنی میں کچھ کہنے کا خیال ہوا، لہذا حنین کی پوری غزل حافظ کی غزل سے غیر شعوری طور پر مستفاد ہو گئی

تا معطر کنم از لطف نسیم تو مشام حافظ
شمہ از نفحات نفس یار بسیار

داسن آلودہ بہ بوئے گل فردوس مکن حنین
ہر چہ می آردی از خاک رہ یار بسیار

الفاظ متغایر ہیں لیکن معنی کے لحاظ سے دونوں ایک نتیجہ پر پہنچے ہیں یعنی ”بوئے دوست“ کی طلب، حصول مراد کے لئے
دونوں کے یہاں دساعت پائی جاتی ہے، حنین خاک رہ یار ہی سے اپنے بڑھے ہوئے جذبہ کا سامان سکون پیدا کرنا چاہتے ہیں خواجہ صاحب
کو نفس یار سے آسودگی ہوتی ہے، بیتیابی دل کے اعتبار سے حنین کا شعر بڑھا ہوا ہے،

شکر آنرا کہ تو در عشرتی اے مرغ چین حافظ
با اسیران قفس مرثدہ گلزار بسیار

اے کہ از سیر چین بال فشان می گزری حنین
برگ سبزے سوئے مرغان گرفتار بسیار

دونوں کے یہاں ایک خیال ہے، دونوں گرفتار قفس ہیں، دونوں قیب کی نظر محنت کے طالب ہیں اور چین میں لوٹ کر جانے کے متمنی ہیں۔

دل دیوانہ ز زنجیر نمی آید باز حافظ
حلقہ از خم آن طسرة طرار بسیار

لب مخمور مرا جرعدہ بند ساقی حنین
چون رسد دور بہن میکہد بردار بسیار

الفاظ متغائر ہیں بظاہر دو خیالات معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل دو نو کے بیان ایک ہی خیال ہے، ایک ہی جذبہ ”قلزم آشنای“ ہے، اور ایک ہی وسعت شوق ہے، حنین کہتے ہیں ایک گھونٹ سے کہیں لب بخور کی تسکین ہوتی ہے۔ پورا میکدہ ادھٹا لاؤسے لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشنای میری (غالب) خواجہ حافظ کے بیان بھی شوق کا وہی دہر ہے، اور حساس کی وہی ناپید کناری، قبر ماتے ہیں کہیں دیوانہ کا دل زنجیر سے رکتا ہے، جسا و محبوب کے کاکل پہچان سے ایک تار لے آؤ، عربی نے کیا خوب کہا ہے،

ہمہ جاد حشی از انست کہ رام است اینجا

ہو اوری از ان سیب ز نندان بوئے
کام جان تلخ شد از صبر کہ کردم بے دوست حافظ
حزین
گر توانی بہ مشام من بسیار
عشوہ زان لب شیرین شکر بسیار
تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ دونو کے بیان ایک خیال ہے، حنین کا مقتضا ”سیب ز نندان“ کی بو ہے، حافظ کی طلب ”لب شیرین“ کا عشوہ، البتہ دونوں کی صورت تحلیل میں اختلاف ہے، لیکن غور کرنے سے دونو کے بیان طلب کی علت غائی بھی ایک ہی معلوم ہوتی ہے، حنین نے ”بیماری“ ظاہر کر دی ہے، حافظ نے اسی کو ”کام جان تلخ شد“ میں پیش کیا ہے

چند بردوش توان خرقہ ناموس کشید
دلق حافظ بچہ از دہ میش رنگین کن حافظ
حزین
مست از صومعہ ام تا سر باز از بسیار
وانگش مست و خراب از سر باز از بسیار
ایک ہی ”جذبہ بے اختیار شوق“ ہے، اور ایک ہی مستانہ انداز ذوق، حافظ صاحب اپنی عادت قدیم کے مطابق دلق درویشی کو شراب سے ملوث کرنا چاہتے ہیں، حنین اپنے خرقہ (تصوف) کو شراب میں ڈبونا تو نہیں چاہتے لیکن نام و تنگ سے مہکدوش ہو کر حافظ کی طرح مست و خراب، بر سر باز ارگزرنا چاہتے ہیں

گرچہ در سینہ صد آتشکدہ آتش دارم
حافظ چون غم و شادی جهان در گزر است حافظ
حزین
للمداحمد کہ با سوزش دل خوش دارم
بہتر آنست کہ من خاطر خود خوش دارم
تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ دونو اشعار میں ایک ہی خیال پایا جاتا ہے، حنین نے اپنے آتشکدہ دل کے سوز و تپش کو ظاہر کر دیا ہے، حافظ صاحب نے ”سوزش دل“ کی تصریح کر دی ہے، اور غم و شادی کی لذت و الم سے جدا ہو کر وجود کی ”بے بقائی“ سے متاثر ہیں، اور حنین کی طرح باوجود محرکات احساس، ایک نشاط باطن اور کیفیت نفس محسوس کر رہے ہیں،

بار عشق کہ از ان چرخ بہ زہار آمد
نوک غمزہ بیا و زہرہ زلف کہ من
حزین
کوہ در دست کہ بر جان بلاکش دارم
جنگھا باول مجروح بلاکش دارم

دونوں مختلف خیالات ہیں، حنین کہتے ہیں ”جان بلاکش“ پر ایک ایسا بار عشق ہے جس سے آسمان بھی پناہ مانگتا ہے، اور دل میں پہاڑ کی طرح ایک درد گران محسوس کرتا ہوں، حافظ صاحب کے یہاں ایک میدان مقاتلہ ہے، ایک طرف ”دل مجروح بلاکش“ ہے اور دوسری طرف خود، لہذا محبوب سے سامان حرب طلب کر رہے ہیں اور وہ ”ناوک غمزہ“ اور ”زرہ زلف“ ہے

حنین نکلند تیرہ غبار غم ایام مرا
مشری صاف تر از بادہ بغیش دارم
گر بہ کا شائہ رندان قدم خواہی زد حافظ
نقل شیر و شکرین و می بغیش دارم
کسی قدر اختلاف ہے، لیکن اصولی حیثیت سے دونوں کے یہاں ایک ہی خیال ہے، اور ایک ہی پیرامن زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے، حنین ”غم ایام“ کی تیرگی سے آزاد ہیں حافظ صاحب کے ”کا شائہ رندانہ“ کی کیا بات ہے وہاں شیر و شکر کا چرچہ ہے، اور شراب و کباب کا سامان، اسلئے دونوں کی زندگی نتیجہ کے اعتبار سے ملتی ہوئی ہے۔

حنین با سر زلف تو گویا شدہ گستاخ صبا
بے سبب خاطر مجموع مشوش دارم
ور تو زین دست مرا بے سر سامان داری حافظ
من بہ آہ سحر زلف مشوش دارم
تذکرہ زلف دونوں میں مشترک ہے البتہ دونوں نے اظہار خیال کے دو طریقے اختیار کئے ہیں

حنین نرد و از سر سودا ز دہ تا حشر برون
پیچ و تابے کہ از ان طرہ دلکش دارم
یک سرموئے بدست من و یکسر باد دست حافظ
سالمہا بر سر این موئے کشاکش دارم
حنین اور حافظ دونوں کے یہاں معشوق کے کامل بیچان کا تذکرہ ہے، حنین کے یہاں پیچ و تاب ہے، حافظ نے اسے ”کشاکش“ میں ظاہر کیا ہے، زلف کی اثر آفرینی دونوں پر یکساں ہے

سنائی و حنین حکیم سنائی عہد غزنویہ کے ”رومی“ تھے، آپ مولانا سے پہلے گزرے ہیں آپ کی کتاب حلیقہ کا ایک انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا ہے، حنین نے آپ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں

از یاد حنین ندی مصرع سنائی را
از یار ہرزخے افکار نباید شد

فغانی و حنین حنین نے اپنی بعض غزلیات کے مقطع میں فغانی کے ساتھ بھی ارادت و عقیدت کا اظہار کیا ہے فغانی اپنے عہد کے بڑے استاد سخن گزرے ہیں اور متاخرین کی آتش بیانی اور جوش خیال بڑی حد تک فغانی ہی کے نام و فغان سے مستفاد ہے، چنانچہ مجمع النفائس میں تقی اوحدی کا یہ قول مسطور ہے، کہ جب وہ عربی شیرازی کے رفیق و جلس تھے، اس وقت مشاعرہ میں فغانی ہی کا کلام مصرعہ طرح مقرر ہوتا تھا، (بگار بابت دسمبر ۱۹۳۲ء عربی شیرازی) شیخ فرماتے ہیں

دایم حنین این غزل از فیض فغانی
ہر جا کہ رود ہمرہ یار است دل ما

ایک دوسری غزل کے مقطع میں کہتے ہیں

حزمین ازین غزلت تازہ گشت طرفغانی
سرد ز سدرہ فرود آید وزمین تو بوسد
رینا لڈاے نکلسن نے مقدمہ دیوان شمس تبریز (مطبوعہ کیمبرج) میں سعدی کو ”نیم دل صوفی“
لکھا ہے سعدی کو تصوف کا مذاق تھا تو ضرور، لیکن آپ کے کلام میں اخلاق و موعظت کا گہرا اثر
پایا جاتا ہے، مقدمہ دیوان شمس تبریز مطبوعہ طہران میں فاضل مقالہ نگار نے مجازیات و عشقیات سے تعبیر کیا ہے، اور
حق یہ ہے کہ شیخ سعدی ایک ہمہ دان استاد گزرے ہیں اور آپ فارس کی عشقیہ شاعری کے سلسلہ ارتقاء کی ایک زبردست
کڑی ہیں، حزمین نے سعدی کے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے، فرماتے ہیں۔

این جواب غزل دلکش سعدی است کہ
کہ نی خامہ آتش نفسم رادم از دست

نظیری و حزمین - حزمین کے مندرجہ ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے، کہ نظیری کا کلام بھی آپ کے زیر مطالعہ رہا ہے، فرماتے ہیں۔

خون غائے حزمین است ز فریاد نظیری
بانگے کہ نباشد کند کوہ صد اہیج

آخری مصرعہ پر غور کیا جائے، تو پتہ چلتا ہے، کہ نظیری کو حزمین نے اپنا استاد اور رہنما تسلیم کیا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر
جب شیخ کے نظریہ استدلال پر غور کیا جاتا ہے، تو پتہ چلتا ہے، کہ اگر نظیری کا کلام ان کے زیر مطالعہ نہ ہوتا تو وہ شاعری کی لذت سے بھی
تا آشنارہ جاتے، ”بانگے کہ نباشد کند کوہ صد اہیج“ کا یہی مطلب ہے،

عرفی و حزمین | شیخ نے اپنے کلام میں کہیں عرفی شیرازی سے ارادت کا اظہار نہیں کیا ہے، لیکن گزشتہ اوراق میں لکھا جا چکا
ہے کہ شیخ نے عرفی کی ایک رباعی نقل کی ہے، مگر حوالہ نہیں دیا، اس سے میں یہ نتیجہ نکالنا نہیں چاہتا، کہ
شیخ نے عمداً عرفی کا حوالہ نہیں دیا تاکہ ناواقف حضرات اسے آپ ہی کی طرف منسوب کر دیں، بلکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ
عرفی کا کلام بھی آپ کے زیر مطالعہ رہا ہے، اور اس کا طرز بیان اور اشعار آپ کے دماغ میں محفوظ بھی رہے ہیں، چنانچہ مفصلہ ذیل
موازنہ سے ایک حد تک یہ نظریہ واضح ہوتا ہے۔

حزمین
سیند آسا در آتشخانہ میرقص
چو خون در زخم صیدے گشتہ می جوش عرفی
ببال شعلہ چون پردانہ میرقص
چو دل در سینہ پردانہ میرقص ---

حزمین
برا فگن خرقہ ہنگام سماعست
مضمون میں کسی قدر اختلاف ہے، لیکن خیال ایک ہے، ”جذبہ پردانہ“ اور ”رقص پردانہ“ دو نو میں مشترک ہے
ز مستوری برا مستبانہ میرقص
برافشان دست بر ناموس و انگہ عرفی
میان محرم و بیگانہ می رقص

حزمین کا ”برا فگن خرقہ“ اور عرفی کا ”برافشان دست بر ناموس“ معنی کے لحاظ سے ایک ہی خیال پر
مبنی ہے، دوسرا شعر بھی ملتا ہوا ہے، یعنی رقص مستانہ کیلئے دو نو کے یہاں خلوت و جلوت، یا مجلس خاص عام کی قید نہیں،

حزین سرودے نیست بہ از غفل سے
 بیائے شیشہ چون پیمانہ میرقص
 عجب ذوقے بود در رقص و مستی عرفی
 تو نیز اسے بادہ در پیمانہ میرقص
 حنین کے مجازی رنگ نے زیادہ لطف پیدا کر دیا ہے، عرفی نے پیمانہ میں شراب کی جھلک دیکھ کر ”رقص مستانہ“ کا حکم لگایا ہے، حنین نے غفل سے کو وہ صوفیانہ سماع اور ذوقیہ لہجہ ترنم سمجھا، جسکے لئے نہ وضعی پردہ سرود اور قانون سخن کی ضرورت ہے، نہ اسرار موسیقی کے درک کی بلکہ ریٹالڈائے نکلسن کے الفاظ میں سقہ کی آواز، موزن کی پکار ہوا کی سائین سائین، بھیر کی صدا میں ایک صوفی کے قلب کو متاثر کر دیتی ہے، یہاں حنین بھی تصوف کے اسی خاص رنگ میں ”غفل سے“ کو تحریک سماع کا ایک کامیاب ذریعہ بتاتے ہیں

حزین نہ کمتر حنین از ذرہ عشق
 مدام از جلوہ جانانہ میرقص
 مشوعرفی رہین باغ و بلبیل عرفی
 بیابانگ چند در پروانہ میرقص

دونوں کے یہاں ایک ہی ذوق سماع ہے، اور ایک ہی لہجہ ادا، البتہ صورت استدلال میں فرق ہے، حنین کہتے ہیں سرگردان عشق ”ذرہ“ سے تو کمتر درجہ نہیں ہونا چاہئے، جو جلوہ یار (آفتاب) سے ہمیشہ مصدقہ رقص ہے، عرفی کہتے ہیں باغ و بلبیل کی قید کیا، دلکو تو ایک ویران کن اور وحشت انگیز الو کی آواز پر بھی محور رقص ہو جانا چاہتے، عرفی کا شعر حنین کے شعر ”سرودے نیست بہ از غفل سے“ سے ملجاتا ہے

سطور بالا سے یہ نظریہ واضح ہو گیا ہے کہ حنین کے ذوق شاعری پر رومی، سنائی، حافظ، سعدی، فغانی، نظیری اور ایک حد تک عرفی کے تخیلات کا اثر پڑا ہے، جسکا شیخ نے (بہ استثناء عرفی) اعتراف بھی کیا ہے،

شیخ کی غزلیات پر جب ایک مبصر کی نگاہ پڑتی ہے، تو وہ اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے، ایک عشقیہ و سراسر صوفیانہ حنین نے رموز عشق اور ذوق صوفیانہ کی ایسی تصریح کی ہے، کہ زبان سے بے اختیارانہ صدائے تحسین نکلتی ہے، مضمون آفرینی، غدوبت بیان، سلاست اور نفاست ادا، میں حنین اپنے دور میں فارسی زبان کے سب سے بڑے شاعر گزرے ہیں، عشق کی لذت آگینیاں کوئی اس دل سے پوچھے، جو کسی نگاہ ناز اور عشوہ لب لعل سے زندگی میں آشنا ہوا ہو، زندگی بھی نشہ شباب کی فریب خوردہ نہیں، بلکہ ایک پاک اور محتاط زندگی، جسے ہجر میں بردلیالی نے ”گرم قریاد“ اور دبدہ پر تمنا کو مصدقہ اشک ریزی رکھ کر محبت کے سخت اور خطرناک منزلوں سے اس سطح پر پہنچا دیا ہو جہاں مجاز حقیقت میں، ملکر ایک ایسا ارفع احساس پیدا کر دیتا ہے، جسے کچھ وہ انسان سمجھ سکتا ہے، جسکے سامنے ”بند نقاب حسن“ برطوت ہو کر ”غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا“ کا منظر موجود ہو، فارس کی عشقیہ شاعری سے کامل طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے ضرور ہے، کہ انان اپنی زندگی کے اس دور کی یاد

تازہ کرے، جسے شکسپیر کے الفاظ میں ”حیات کے سات مراحل“ میں سے ”مرحلہ عشق“ کہتے ہیں، وہ عشق نہیں جس کے باطنی فیوض و برکات کو طوفان شباب بہا لے گیا ہو، بلکہ وہ پر کیف محبت اور نشاط انگیز لذت درد جس کے امیال و عواطف نے انسانی زندگی کو ”رنج نو میدی جاوید“ کے باوجود کسی عذرہ یا سلمی سے وابستہ رکھا ہو، سامان وصل مفقود ہو، تکلم و ترسل استحالہ کی حد تک پہنچ گیا ہو، اگر انفرادی زندگی کا وہی دور ہو یا کم از کم اس دور کا نقشہ پیش نظر ہو، تو حنین کی عشقیہ شاعری البتہ ایک سمندرِ ناز کو لطف تازیانہ سے آشنا کر سکتی ہے، ملاحظہ ہو۔

دل در شکن زلفت صبح طربے دارد
مہتاب بنا گوشت فرخندہ شبے دارد
در میکدہ خاکم را پیسانہ کنی یارب
شاید دل حسرت کش لب را بہ لبے دارد
افسانہ کند خویش آشوب قیامت را
دل بہیدہ در کولش شور و شغبے دارد
بے رنج نہ شد حاصل نے کفر نہ ایمانم
از بتکرہ تا کعبہ رنج و تعبے دارد
بکشانے حنین چشمے کان مہر جان آرا
در محل ہر ذرہ یلیٰ نسبے دارد

”شکن زلف“ کے ساتھ ”صبح طرب“ اور ”مہتاب بنا گوشت“ کے ساتھ فرخندہ شب کا تلازم ایک نہایت دلکش طرز بیان ہے، استعارہ جمیل قابلِ داد ہے، دوسرے شعر کے متعلق مقدمہ میں لکھا جا چکا ہے، ”آشوب قیامت“ کا ایک فسانہ ہو جانا، کچھ وہی سمجھ سکتا ہے، جسے قیامت کے ہولناک واقعات کا احساس ہو، اور پھر خواب ناز میں محو ہو جانے والے کو بھی دکھایا ہو، جسکی ادائے بیدار اور رعنائی نے قیامت کو محض ایک افسانہ بنا دیا ہے، غالب کہتے ہیں ”کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور“ کفر و ایمان کا ایک سطح پر آ جانا بہت پر لطف ہے، اس طرز میں عرفی کے بہترے اشعار پائے جاتے ہیں آخری شعر وحدت فی الکثرت کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ (Pantheism) فارسی شاعری کا ایک نہایت اہم موضوع تخیل ہے مولانا روم کے اکثر اشعار اسی خیال سے متعلق ہیں،

ازین دہشت کہ ہجرانے مبادا در کمین باشد
ز حسرت ہر نگاہ من نگاہ واپسین باشد
شیخ نے جس سرشارانہ طریقہ سے ”حسرت نگاہ“ اور ”نگاہ واپسین“ کا نقشہ کھینچا ہے، اسے وہ ناکام محبت سمجھ سکتا ہے جسے شوق و انتظار کے بے شمار مراحل کے طے کر لینے کے بعد محبوب کی اتفاقی ملاقات نصیب ہو جائے، اور یہ موصفت اندیشہ ناک سے خالی بھی نہ ہو، اس وقت نگاہ پر حسرت کی یاس افزا ٹکٹکی وہی منظر پیش کرتی ہوگی، جو ایک درد مند محبت محبوب سے جدا ہوتے وقت ”نگاہ واپسین“ یا آخری نظر کی صورت میں پیش کرتا ہے، الفاظ تشریح کے لئے ناکافی ہیں ہاں تصور کے بعد ہر شخص لذت احساس سے متکیف ہو سکتا ہے۔
گرہ پیاز و زبان شعلہ شمع انجمن پیرا
ہر محفل کہ حرفے زان غدار آتشین باشد

اس غزل کا ہر شعر حزمین کے وفور تمنا کا منظر ہے، یہاں تشبیہ، تجنیس، مدح، تمام خصوصیات نے ملکر شعر کو نہایت بلند سطح پر پہنچا دیا ہے، جس محفل میں سلمیٰ کے عذار آتشیں کا تذکرہ آئے وہاں شمع کی ٹوکا نو دا اضطراب شاعر کے جذبہ کی تاپید کناری کا ایک اعلیٰ ثبوت ہے، ”زبان شعلہ شمع“ سے محبوب کے رخسار کی تشبیہ، اور پھر مشبہ بہ پر مشبہ کا تفوق جداگانہ لذت انگیز ہے، مگر حصول لذت کے لئے تصور شرط ہے

شود در موج آب زندگانی سبزہ اش غلطان دران گلشن کہ ابردئے ترا از ناز چین باشد

”چین چین“ یا رسے گلشن میں نباتات پر تردد تازگی آجانا وہی سمجھ سکتا ہے، جو عرصہ کی فسر دگی حیات کے بعد محبوب کی غلط انداز نگاہ ناز سے لذت آشنا ہوا، ہو

فریب حرت و صورت خضرم از جابر نمی آرد کہ آب زندگی لعل ترا زیر نگین باشد

آب حیات لانے میں خضر کی ناکامی کا راز یہ ہے کہ اب آب حیات کا مقام ظلمات نہیں رہا بلکہ وہ اب شیخ کے محبوب کے لعل کے زیر نگین ہے، کیا لطیف اسلوب بیان ہے، کس خوبی سے ”لب لعل“ تک دسترس ہونے کو آب حیات تک رسائی سے تعبیر کیا ہے، پر وہ ظلمات کو طے کر لینے کے لئے جن منازل سے گزرنا ناگزیر ہے، وہ الگ، سکندر کی سرکشگی اور نامرادی کا فسانہ بھی پیش نظر ہے، محبوب کے لب لعل سے سیرابی کی تمنا میں بھی دقتیں ہیں، اور نامرادی و یاس کا منظر،

نگاہ گرم چون رخسار آتشیں تو بوسد عرق چون شبنم گستاخ یا سمین تو بوسد

جذبات، تشبیہات اور استعارہ کے مخلوط اثر نے شعر میں بڑی حلاوت پیدا کر دی ہے، - منظر پر خیال کیجئے اور جذبات کی داد دیجئے، ایک عاشق بیباک، شاہد ناز کے رخ زیبا پر نظر جمارہا ہے، یہ گویا رخسار کا بوسہ ہے جو نگاہ لے رہی ہے، یہیں تک بس نہیں آگے دیکھئے اس منظر سے محبوب پر کیا اثر ہوتا ہے، جذبہ حیا میں محبوب کے چہرہ سے پسینہ نکل آیا ہے، محبوب کو بھی بازاری نہیں ہونے دیا، ایک نہایت پاک سیرت اور عصمت دار تصور کیا، یہیں تک ختم نہیں ہے، بلکہ اس منظر کی بھی ایک اور تشبیہ دی ہے، جو اس قدر لطف انگیز ہے کہ دل پھڑک اٹھتا ہے، اس عاشق بیباک کی نظر بازی سے محبوب پر جذبہ حیا طاری ہوا، حیا کا مقتضا تھا کہ پسینہ نکلے، اب پسینہ کو ”شبنم گستاخ“ سے تشبیہ دیتے ہیں جو یا سمین کی پلک پر بوسہ لیا کرتی ہے، گویا رخسار محبوب یا سمین ہے اور پسینہ ”شبنم گستاخ“

خدائے را خرامی یہ کشت باغ مبادا دہان غنچہ کف پائے نازنین تو بوسد

صرف جذبات کی داد دیجئے، محبوب کی سیر باغ سے غنچہ ”کاف کف پائے نازنین“ کو چوم لینا، شاعر کی عجیب وارفعلی محبت کو ظاہر کرتا ہے،

بیا بتاب بازوئے حسن دست تجلی کہ معجزیدہ یضاً سر آستین تو بوسد

”دست و بازوئے“ شاید کو معجزہ مضیا کا بوسہ دنیا لطف سے خالی نہیں،

کند بہ ساغر ہوش فرشتہ داروئی مستی تیسے کہ لب سحر آفرین تو بوسہ
کوئی جدت نہیں، معنی صاف ہے، الفاظ سادہ ہیں البتہ ”نقشہ تبسم“ قابل غور ہے، تاکہ ”سحر آفرینی“ کا صحیح ادراک
ہو، ورنہ فرشتہ کے لئے تبسم کے ”شراب مستی“ انہوں نے پر شاعر ذمہ دار نہیں،

بقدر قابلیت میوہ افشاست ہر نخلے ازان سرد سی زیبائی اندام می بارد
انگور کی لت سے انگور پھلتا ہے، سیب کے درخت سے سیب قامت محبوب بھی ایک درخت ہے اسکا پھل زیبائی
اندام (تناسب) (عضا وغیرہ) ہے، جو سرد سی کی خصوصیت ہے،

نفس پروردہ خون ساز تار نگین سخن گزری شمر از نخلہائے تشنہ اکثر خام می بارد
فراتے ہیں اپنی ہستی کو خون سے سیخ سیخ کر نشو و نما دو، تب رنگین سخن ہو سکتے ہو، ورنہ پیاسے درختوں سے اکثر کچا ہی
پھل گر جایا کرتا ہے، ”رنگین سخن“ کے لئے ”خون“ کی رعایت اور نباتاتی نظریہ سے استدلال بہت عمدہ ہے، دو نو
صورتیں ہو سکتی ہیں عاشق بنکر خون ہاؤ، یا طالب علم بنکر جگر ریزی کرد، مگر کلام کی پختگی کے لئے نفس کو خون سے پرورش کرنا
ضروری ہے

رجیم صد بیا بان خار خار بخودی جوشد بہ خوابم گر شبے آن شاخ گل مست و خراب آید
جازی رنگ کیساتھ جذبات کی فراوانی قابل داد ہے، خواب میں محبوب کا مست و خراب آنا اور پھر گریبان عاشق
سے خار بخودی کا جوش تجربہ سے متعلق ہے، جسے ”شبہائے فراق“ میں، محبوب کو خواب میں دیکھ کر آنکھوں کو وقفہ اشک
ریزی کو رکھا ہو وہ اس بلند تخیل سے پرکیت ہو سکتا ہے

حجاب عشق می بند و نظر مجنون سکین را اگر لیلی برون اند پردہ شرم و حجاب آید
اگر لیلی پردہ شرم و حجاب ترک کر کے مجنون کے سامنے آ جائے جب بھی غریب مجنون کی آنکھوں کا بند ہو جانا وہی سمجھ
سکتا ہے، جس نے حجاب عشق کا ذاتی تجربہ کیا ہو، ایک بواہوس کی نگاہ معصیت آلود اسے سمجھ نہیں سکتی، اسی
معنی میں رعب حسن بولتے ہیں

ز شوخی لیلی ناز آفرین رامی کند مجنون اگر طرز نگاہت چشم آہورا بہ خواب آید
تمام شعر نے معشوق کی آنکھوں کو نرگس شہلا سے تشبیہ دی ہے، لیکن حزمین نے جس عجیب انداز سے محبوب کے طرز
نگاہ کی تفسیر کی ہے، وہ آپ ہی اپنی نظر ہے، شیخ اپنی عادت کے مطابق ایک ہی تشبیہ پر کلام ختم نہیں کیا بلکہ اب مشبہ بہ کے طرز
آموختنی کا اثر دکھا رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ آہو کو اگر محبوب کا طرز نگاہ خواب میں دیکھنا نصیب ہو جائے تو مجنون تو درکنار

خود لیلی بھی ایسے غزال حرم کو دیکھ کر دیوانی ہو جائے

دردن لبریز داغ عشق آتشپارہ دارم حنین از دل اگر آہے کشم بوئے کہا بید
فرماتے ہیں دل میں عشق کی آگ لگی ہوئی ہے، اس لئے جو آہ بھی کھینچتا ہوں اس سے بوئے کباب آتی ہے یعنی
دل جل بھنکر کباب ہو گیا ہے

یہ گلشن غنچہ یاد از نوشندان می دہد مارا نشانے سرو از بالا بلنداں می دہد مارا
مناظر فطرت کا مطالعہ کر نیچے بعد اپنی استعداد دماغی اور پرواز نفس و روح کے مطابق شعرا نتائج پیدا کرتے ہیں
شیخ علی حنین نے اس غزل میں نہایت پر لطف متلیج نکاسے ہیں گلشن میں غنچہ کو دیکھ کر ”نوشندان کی یاد“ اور سرو کو دیکھ کر
”بالا بلنداں“ کا نقشہ کھینچ جانا، دماغ کی فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں کی طرف رہنمائی کر رہا ہے، آگے چل کر فرماتے ہیں
کتم قالب تھی چون نقش پابنیم براہ او خبر از حال زار مستند ان می دہد مارا
سید انشانے اپنی اس زندگی میں جب دربار سے تعلق ترک ہو گیا تھا، افلاس اور غربت مستولی تھی، پریشان حالی سے
زندگی گزارتے تھے ایک مشاعرہ میں اپنی غزل پڑھی سامعین پر ایک خاص کیفیت طاری تھی، چاروں طرف ایک سکوت
کا عالم تھا، اس غزل کے دو اشعار یہ ہیں

نہ چھپڑاے نکمت باد بہاری راہ لگ پتی تجھے اشکویلیاں سو جھی ہیں ہم بنیرا بیٹھے ہیں
دوسرا شعر حنین سے ملجاتا ہے۔

لسان نقش پائے رہرواں کوئے تمنائیں نہیں چلنے کی طاقت کیا کرین تا چار بیٹھے ہیں
اسی کے مقابلہ میں حنین کا ایک اور شعر ہے۔

یاران سبک سیر رسید بہ منزل چون نقش قدم ماندہ بجاقسا فلتا ما

اسیر بیج و تاب موج اشک لودہ مشرگانم فریب سنبل گیسو کنداں می دہد مارا
تشبیہ قابل داد ہے، مشرگاں اشک آلود ہے، اور موج اشک کے چچ و تاب میں اسیر اسے دیکھ کر ”شاہد ان گیسو
کنداں“ کے سنبل نماطہ پیاپاں کی طرف شیخ کا دماغ منتقل ہو گیا ہے۔

بدشت از جلوہ ہائے لالہ داغ تازہ می گردد کہ یاد از سینہ ہائے درد مندوں می دہد مارا
اس مضمون کو اکثر شعرائے فارس نے مختلف پیرایہ میں بیان کیا ہے، چنانچہ حافظ، جامی، صائب کے یہاں
بھی یہی خیال پایا جاتا ہے۔

حافظ:- زحسرت لب شیریں ہنوز می بینم
جا می:- بسکہ رفتند شہیدان غمت زیر زمین
صاحب:- یادگار جگر سوختہ مجنون است
کہ لالہ می دمد از خاک تربت فرہاد
لالہ ہا غرقہ بہ خون می دمد آن صحرا را
لالہ چند کہ از دامن صحرا بر خواست

رم وحشی نگاہ او بو حشت دادہ آرام
جبین کبہ و دیر است بر خاک نیاز او
ندارد گر نظر بامنا تغافل نیست کار افزا
حنین آشفتمہ عالم آہ ازان دامن فشانہا
رم وحشی نگاہ، محراب طاق ابرو، ”دامن فشانہا“ اور خاک عاشق کا سپرد طوفان ہونا، غضب کے فقرے
ہیں، نزاکت تخیل اور لطافت احساس قابل داد ہے

دل عاجز حریف ترک چہمت کے تواند شد بخون غلطانہ مہر گانت صف خنجر گزارا

حزین کی صوفیانہ شاعری | شعرائے فارس میں مشکل سے کوئی ایسا شاعر ہوگا جسکی غزلیات میں تصوف کی چاشنی
ہو، اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ فارس کے اکابر شعرا و اساتذہ سخن رہبر و طریقت تھے،
دنیا کو نقش قدم کی تلاش رہتی ہے متاخرین میں جو صوفیانہ مذاق نہ بھی رکھتے تھے، انھوں نے بھی صوفیانہ طرز میں کہنا
شروع کیا، تعلیم کے اعتبار سے حزین ایک مشہور صوفی شیخ خلیل اللہ طالقانی کے تربیت یافتہ تھے، دوسری بات یہ ہے کہ اکثر صوفی
ہی شعرا کلام آپ کے زیر مطالعہ رہا ہے جسکی تفصیل اوپر گزر چکی لہذا آپ کے کلام میں بکثرت صوفیانہ جذبات پائے جاتے ہیں
نہ در کنعان نہ در بازار مصرت می توانی یوں بیا یاں گرد حیرت کردہ شوق کا ردائہارا

گریبان چاک باشد دلق ماتر دامناتاکے
سلوکم در طریق عشق با یا راں چناں ماند
بے آلودہ گرداں خرقہ پرہیزگاراں را
کہ مور لنگ ہمراہی کند چابک سواراں را

چولالہ باچمن حسن و عشق خوشست مرا
بہ گورد بام و درم دیر و کعبہ می گرد و
مے مجاز و حقیقت بیک مبدوست مرا
ازاں زماں کہ بدر گاہ عشق روست مرا

ز خود ہنی شدہ ام چوں فی دزنالہ پرم خروش درد تو بیچیدہ در گلوست مرا

ہیں تنہا نہ من در خاک و خون غلطیدہ اوم نہاد آں زلف مشکیں بر زمین ناف غزالاں

شایستہ برق است بہ صحرائے ملامت
پیرانہ سرآزادگی از عشق نہاد اریم
اے یخچراں پائے طلب رنجہ مسعا زید
گر موج زند برب ما تلخی عالم
یاراں سبکیر رسیدند منزل
دستاں زن مستیم حزمین تا نفسے هست
خارے کہ بہ خوں تر نہ شد از آبلہ ما
رگہا شدہ در گردن ما سلسلہ ما
نزدیک تر از ماست بہا مرحلہ ما
ہرگز نہ زند چیں بہ حبس حوصلہ ما
چون نقش قدم ماندہ بجاقا فلہ ما
از عشق نکو نام بود سلسلہ ما

تشبیہ جمیل اور استعارہ بیچ نے لطافت معانی کو دہ بالا کر دیا ہے، آبلہ یا ہو کر حوصلہ بادیہ پیمائی اور پیرانہ سالی میں بھی
و البستگی قابل داد ہے، سلسلہ زوادی میں مقید رہتے رہتے زنجیر کارگ کی شکل میں منتقل ہو جانا، نہایت لطیف انجیالی کی طرف اشارہ
کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ ضعیفی میں رگین ابھرتی ہیں تو گویا رگہائے گردن وہ ”سلسلہ محبت“ ہیں جس میں مدتوں گرفتاری رہی، لہذا
جب قید و بند کا تعلق فطرت جسمانی سے ہو گیا تو گویا اسکے یہ معنی ہیں کہ اس وقت بھی آزار محبت سے آزاد ہونا، ناممکن ہے، پانچواں
شعر بہت یاس افزا ہے۔

حزمین نے خود اعتراف کیا ہے کہ انکی شاعری میں صوفیانہ فکر و عقاید کی روح مولانا روم کے فیوض و برکات کی منت کش ہے،
اس سلسلہ میں شیخ اور مولانا کی مفصلہ ذیل غزلیات کا موازنہ حقیقت کو اور واضح کر دیتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے مولانا
کی غزل پڑھنے کے بعد اپنے اشعار کیے ہیں

حزمین	بقید آب و گل اے جان نا توان چونی درین کہن قفس اے سدرہ آشیان چونی	دلاچہ بستہ این خاکدان برگزراں ازین حظیرہ بردن پر کہ مرغ عالم جانی	رومی
حزمین	زال خضر ترا سینہ چاک می طلبد نفس گداختہ دنیاں کاروان چونی	ہمی رسد ز سموات ہر صبا ح نہایت کہ رہ بری بہ نشانہ چو گردہ بنشانی	رومی
	تو رشک یوسف مہربی فتادہ در چہ تن تو بارکنگر عرش بہ خاکدان چونی	تویار خلوت نازی مقیم پردہ رازی قرار گاہ چہ سازی درین نشین فلانی	

تو شمع محفل انسی بہ تیرہ دشت گاہ
تو مرغ عالم قدسی ندیم مجلس انسی
حزین
توزیب مسند قدسی برآستان چونی
دریغ باشد اگر تو درین مقام بانی

خیالات میں جو توافق اور بیان میں ہم آہنگی ہے، محتاج بیان نہیں، بعض جگہ ایسا توارد ہے کہ حنین کی جگہ کوئی اور ہوتا، تو مدح کی بجائے قدح ہوتی مگر اس سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ مولانا کی غزل کے زیر مطالعہ آنیکے بعد حنین نے اپنی غزل کہی،

محاسن کلام حنین | کلام حنین کی خصوصیات میں آپکی مضمون آفرینی، نازک خیالی، استعارہ آمیز و مجازی تعبیرات ہیں اپنے اخلاقی درس بھی دیا ہے، لیکن کم، شیخ کی جس غزل کو لیجئے، اسکا ہر شعر و لولہ انگیز ہے، ابھی سامع

ایک ہی شعر کی نازک خیالیوں سے کافی طور پر لذت اندوز نہیں ہو لیتا، کہ دوسرا شعر نظر کے سامنے آتا ہے، جس میں حلاوت بیان، ندرت فکر و جدت خیال اور سلاست عبارت پائی جاتی ہے، دل لوٹ جاتا ہے، پھر مسلسل ایسے ہی اشعار آتے ہیں اور سامع پر ایک عجیب و جدا انگیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے، میرے اس دعویٰ میں حنین کی بدیہ گوئی کی مثال پڑھئے جو انکی سطور میں لکھی جا چکی یا پھر ”اذین حسرت کہ ہجرانے مباد اور کین باشد“ والی غزل پڑھئے، شیخ کے محاسن افکار کو عنوان ذیل کے ماتحت رکھ سکتے ہیں

نازک خیالی | زتاراج بہاراں مست در نگیس جلوہ می آئی
خانا بود کہ جوشان خون گلزار است از دست

پہلے محبوب کے دست خاشدہ کا تصور شرط ہے، اب غور کیجئے کس لطیف طریقہ سے اس منہدی کے رنگ کے خون گلزار کی ریزش بتائی، رعایت لفظی بذات خود ہے، ”زتاراج بہاران“ کو ”بربادی عزیزان“ سمجھ لیجئے اب معنی صاف ہے، کہ دست محبوب میں جو خانی رنگ دیکھتے ہو وہ غالب مرحوم کے مرثیہ ”انکے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد“ کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ تو ان محبوبان الفت کا خون ہے جنہیں پیش عشق نے درجہ شہادت عطا کیا،

خرام ناز تو اے شوخ گل قیامت را
بجاک عاشق خونیں کفن فرور یزد

”عاشق خونیں کفن“ اور ”گل“ میں جو رعایت معنوی پائی جاتی ہے، وہ ظاہر ہے، قیامت تک خونیں کفن عاشق کی قبر میں ”خرام ناز“ کا اثر قابل داد ہے، میرے خیال میں شیخ صاحب ”عاشق خونیں کفن“ کے قبر کو ”خرام ناز گل“ کے بدل ”رنگ گل“ کا منت کش بتاتے تو زیادہ اثر آفرین ہوتا، قبر عاشق میں خرام ناز کا اثر صرف عشقیہ عقیدت مند ہی ہے غالب بھی فرماتے ہیں ”خون ہے دل خاک میں احوال بتان پر یعنی“

مگر افگندہ لعل آبدار رش از نظمی را کہ اشک حسرتی از دیدہ پیمانہ می آید

معتوق کالب لعلین سے پیالہ شراب جدا کر دینا اور اس لئے دیدہ پیمانہ سے اشک ریزی منظر یہ شاعری ہے، اور مجھ جیسے ”زابد خشک“ یا ”پختہ وضع زابد خام“ سے اسکی تشریح ہو نہیں سکتی، اور اگر صرف ایک فلسفی کی طرح صرف تصور اور

تخیل سے کام لے کر نقشہ لفظی پیش کیا جائے، تو کہیں حریفان درد آ شام کی بارگاہ سے ”باحیب نشینی و بادہ پیائی“ کا فتویٰ نہ صادر ہونے لگے، جو کچھ بھی ہو، شیخ صاحب نے یہاں بڑی لطافت تخیل سے کام لیا ہے، قاعدہ ہے کہ جب پیانہ شراب منہ سے جدا کرتے ہیں، تو کچھ لب و دہن اور کچھ پیانہ سے چھلک کر شیشہ کے بالائی سطح پر آ جاتا ہے، اور وہ کنارہ پیانہ سے قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکتا ہے اب شعر کے الفاظ پر غور کیجئے، حنین نے پیانہ کی یہ حالت دیکھ کر نتیجہ نکالا ہے کہ پیانہ کی یہ تراوش اسکی اشک ریزی ہے جسکی علت یہ ہے کہ محبوب نے اسے اپنے لب لعل سے جدا کر دیا ہے

تجلی زار می بینم سر خاک شہیدان را مگر شمع بہ طوف مشہد پردانہ می آید
خاک شہد اکا تجلی نزار ہو جانا اس بنا پر ہے کہ زندگی میں تو پردانے طواف شمع کیا کرتے تھے، اب انکے جلنے بھننے کے بعد شمع ہی طوف پردانہ کرنے آ رہی ہے

وحدت فی الکثرت | عکس راست کہ دارد ہمہ جاہو حین چہرہ پردازد آئینہ ایجاد یکے ست
یہ رنگ سخن رومی کی خصوصیات کلام میں ہے، ذات باری کے متعلق سورہ نور کی آیت حنین کے تخیل کو واضح کر دیتی ہے، المصباح فی الزجاجة الخ

عالم عرفان | نقاب زلف زعارض اگر بر اندازی صنم ز طاق دل برہن فروریزد
یہی تو موسیٰ سے بنی اسرائیل نے بھی کہا تھا، لمن تو من لک حتی غری اللہ جھوٹا فرق صرف یہ ہے کہ حنین کے یہاں مسئلہ کا اثباتی رخ ہے، اور بنی اسرائیل کے یہاں منفیانہ
مرقع حسرت | گل می شنود خندان نالیدن بلبیل را از زاری ما جانان بیزار نباید شد
اخلاقی سبق | حنین کہ بنجر از خود ز خود خبردار است ترا کہ با خودی از خود خبر نمی آید

فراش می کند مار ابو صلت چون رقصہ شود بیگانه از یاران دنی چون دلتے یابد
تمتہ حالات و کلام شیخ محمد علی حنین | ابھی تک شیخ کے حالات زندگی اور تنقید کلام کے متعلق میں نے کلیات حنین مطبوعہ نو لکھنؤ کا ایک پرانہ نسخہ سامنے رکھ کر اور صرف اپنی کاوش و جستجو اور ذوق تنقید پر اعتماد کر کے لکھا ہے، لیکن شیخ کی شخصیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اسے صرف انفرادی رائے پر منحصر نہ رکھا جائے، لہذا ضرورت ہوئی کہ تاریخ اور سیرت کے متعلق ان کتابوں کی ورق گردانی کی جائے جو شیخ کے عہد میں لکھی گئیں یا بعد میں لکھی گئیں لیکن مصنف نے واقعات کی ترتیب اور کلام پر رائے زنی کرنے میں اپنی صحت ذوق اور نکتہ شناسی کا ثبوت دیا ہے، اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل کتابیں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں جن کے مطالعہ کر نیے بعد شیخ کے عہد کی زندگی

سامنے آجاتی ہے، جب وہ ہندوستان کی مذمت میں سرگرم اور اسکے بعض ارباب سخن سے برسرِ مجادلہ تھے، اور اخیر عمر تک یہی حالت قائم رہی۔

ماخذ اور بعض تذکروں پر تنقید | تذکرہ شعرائے فارس کے سلسلہ میں تقریباً چالیس کتابیں پائی جاتی ہیں جن کے قلمی نسخے اور نیٹل لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں، ان میں چند تذکروں کے سوا جن میں تذکرہ شعراءِ دولت شاہ، عرفات العاشقین مصنفہ تقی اوصدی البلبانی اور نفحۃ الانس جامی بھی شامل ہیں، قریب قریب تمام تذکروں میں شیخ حنین کے متعلق کم و بیش تاریخی اور تنقیدی واقعات ملتے ہیں، لیکن تاریخی واقعات کی جستجو میں معاصرین کے بیانات ترجیحی پہلو رکھتے ہیں، لہذا ریاض الشعرا مصنفہ علی قلی خان واغستانی متخلص بہ والہ، مجمع النفائس مصنفہ سراج الدین علی خان رزوید بیضا مصنفہ غلام علی آزاد بلگرامی کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی، یہ تینوں ارباب فضل و کمال شیخ کے معاصر تھے، صرف یہی نہیں بلکہ شیخ کیساتھ والہ واغستانی اور آزاد بلگرامی گہرے تعلقات تھے، شیخ جب ہندوستان میں تشریف لارہے تھے، تو اتفاقاً والہ واغستانی بھی ساتھ ہو گئے، اور بندرعباس تک دونوں کا ساتھ رہا، دہلی میں آئے تو کچھ دنوں والہ کے یہاں شیخ ٹھہرے بھی اور جب لاہور میں زکریا خان بہادر دیر جنگ صوبہ دار نے شیخ کی ایذا رسانی کا ارادہ کیا، تو والہ نے اپنے بھائی حسن قلی خان کاشی کو جو محمد شاہ کی طرف سے نادر شاہ کے دربار میں سفیر بن کر گئے تھے، اور اس زمانہ میں لاہور کے اطراف میں پہونچ چکے تھے، لکھا کہ شیخ کو ساتھ لیتے آئیں چنانچہ خان موصوف شیخ کو صحیح سالم ساتھ لائے، غلام علی آزاد بلگرامی جب سیوستان سے واپس آ رہے تھے، تو شہر بہکھر میں شیخ سے ملاقات ہوئی، اور پر لطف صحبتیں رہیں، اسی عارضی ملاقات میں شیخ جیسے نازک مزاج فارسی الاصل میریپے ہندی نثر ادیب سے کچھ ایسے مالوف ہو گئے کہ اپنے قلم سے اپنے چند اشعار لکھ کر آزاد بلگرامی کو روانہ کئے، وہ اشعار یہ تھے:

پیش از ظہور جلوہ جانانہ سوختیم آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

نگر د غرق طوفان کشتی بے لنگر عاشق بود دریا نمک پروردہ چشم تر عاشق

بہ جلوہ ہائے رسا سرفراز می آئی مگر ز غارت عمر دراز می آئی
گہ بہ خلوت خاص صدق نمی آید چنین کہ در دل اہل تیار می آئی

جب آزاد مہوم ید بیضا لکھ رہے تھے تو شیخ دہلی میں تھے

سراج الدین علی خان آرزو ہندوستان میں شیخ کے ادبی معرکہ آرائی کے حریف مقابل تھے، دہلی میں دونوں کا ساتھ رہا ممکن ہے شیخ کی نازک مزاجیوں اور جذبات انانیت نے خان آرزو کو صحبت شیخ سے روکا ہو لیکن دوہم مذاق معاصرین کا ایک ہی شہرین

لہ ریاض الشعرا جلد اول ص ۷۷۷

رہنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے سے ملاقات کی ہو، خان آرزو، ایک ہندوستانی تھے اور شیخ کے خریف مقابل
 لہذا شیخ کی اس ہجو یہ شاعری کی داد نہیں ضرور دینا تھی جس نے خان آرزو اور شیخ کی زندگی کو لازم و ملزوم کر دیا اور ایک تذکرہ
 نویس کے لئے ناممکن ہے کہ شیخ کے حالات زندگی بیان کرنے میں، و د خان آرزو کا تذکرہ نظر انداز کر دے، اس سے میری مراد خان
 آرزو کی کتاب تنبیہ الغافلین ہے، جسے خان موصوف نے شیخ حزن کی ہجو یہ شاعری (متعلقہ ہند) کے جواب میں لکھا ہے
 آئندہ سطور میں، میں یہ بتاؤں گا، کہ خان آرزو نے تنبیہ الغافلین لکھتے وقت جب شیخ دہلی میں تھے، تو کونسا لب و لہجہ
 اختیار کیا تھا، اور جب وہ مجمع النفائس لکھ رہے تھے اور شیخ بنارس میں جا کر عزت گزین ہو گئے تھے تو خان آرزو کے
 خیال میں کیسی بے باکی، اور اظہار میں کیسی حریت آگئی تھی، مجمع النفائس، ریاض الشعر کے بعد کی تصنیف ہے بعض
 ایسی باتیں جو تذکرہ بالاتذکرہ بالان میں نہیں پائی جاتیں مینے غلام ہمدانی متخلص بہ مصحفی کی کتاب عقد ثریا اور
 مخزن الغرائب مصنفہ احمد علی ہاشمی سندیلہ سے لی ہیں، لیکن باوجود کاوش و تاریخ کی کتابوں سے مصحفی کی روایت کی تصدیق
 نہ ہو سکی، عہد محمد شاہی کی تاریخ میں شیخ حزن کا تذکرہ نہیں پایا جاتا، عہد محمد شاہی کے ایک اہل قلم نے ”تاریخ محمد شاہ“
 کے نام سے، محمد شاہ کی حکومت کے ابتدائی عہد کی تاریخ لکھی ہے، جو پٹنہ اور نیٹل لائبریری کی فہرست کتب فارسی میں
 نمبر ۱۳۴ کے مقابل مندرج ہے، یہ قلمی نسخہ میری نظر سے گزرا، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے اپنے ایک باری
 دوست (جن کا نام بھی مندرج ہے) کی فرمائش سے لکھی ہے، اس میں حزن کا تذکرہ نہیں ہے، ہاشم مخاطب بہ خانی خان نے
 منتخب اللباب نامی ایک کتاب لکھی اور بابر سے لیکر محمد شاہ کے زمانہ تک تمام تاریخی واقعات قلمبند کئے، یہ عہد مغلیہ کی ایک
 نہایت مستند اور معتبر تاریخ ہے، لیکن باوجود درج کردہ ان اس میں حزن کے متعلق ایک لفظ بھی نہ مل سکا، اسی طرح
 محمد علی خان انصاری (مصنف بحر المواجز نے تاریخ مظفری کے نام سے عہد مغلیہ کی ایک قابل ادب تاریخ لکھی اور اس میں
 تذکرہ شعر کے متعلق ایک عنوان قائم کر کے شعرائے متقدمین اور متاخرین پر ایک سرسری نظر ڈالی چنانچہ اس ضمن میں ابوالعلا
 گنجوی اور خاقانی کے تعلقات، شاہ اسماعیل کے ساتھ امیر معزمی (شاعر) کا عشق، اور تیرکھا کر جان دینا عہد اکبری میں
 محمد حسین نظیری کا ورود ہند، ابراہیم عادل شاہ کی سلطنت اور فارس سے نور الدین ظہوری کی آمد فیضی اور عرفی کے
 مطالبات، تمام واقعات پر روشنی ڈالی لیکن حزن کا تذکرہ نہیں طرفہ یہ کہ شیخ حزن کے خریف مقابل سراج الدین علی خان
 آرزو کے حالات زندگی اور تصنیفات کے متعلق کسی قدر تفصیلی واقعات لکھے، لیکن وہاں بھی حزن کے متعلق ایک لفظ
 نہ لکھا، الغرض عہد محمد شاہی کی ان تمام تاریخی کتابوں میں حزن سے بے اتفاقی کی گئی، براؤن نے لٹریچر ہسٹری آف
 پرشیا جلد ۳ میں ایک جگہ مسلسل، اور دو تین جگہ سرسری طور پر حزن کے کلام اور زندگی پر تبصرہ کیا ہے، براؤن کے نزدیک
 شاعر سے ستہ ۶ تک فارس کی تمام تاریخ میں نہایت خشک ادبی دور ہے، اس زمانہ میں اگر کوئی مشہور کلام منصفہ شہود پر
 لہ ریاض الشعر دیباچہ تنبیہ الغافلین ۱۰ مجمع النفائس

آیا تو وہ ہاتھ اصفہانی کا ترجیع بند ہے، جسکے متعلق پروفیسر موصوف نے ایک عالمانہ بحث کی ہے، اور نمونہ کلام پیش کیا ہے، اسکے بعد براؤن لکھتے ہیں کہ اس دور کے تاریخی حالات ہماوگ دو نہایت مستند اور کامل اہل قلم کے زمانوں میں پاتے ہیں، یہ شیخ محمد علی حزن اور لطف علی بیگ تخلص بہ آذرہین، دونو شاعر تھے اور سابق الذکر بڑے پایہ کے شاعر تھے چونکہ انھوں نے اپنے کلام کے تین یا چار دیوان مرتب کئے تھے، اسکے بعد پروفیسر صاحب اپنا ذاتی خیال لکھتے ہیں کہ ہماوگون کے نقطہ نظر سے انکی نثر نگاری نظم سے زیادہ قابل وقعت ہے، سلسلہ ۱۲ء میں شیخ حزن نے مدت العمر نام سے شیخ ہماو الدین عالمی کے کشکول کی طرح ایک مجموعہ تیار کرنا شروع کیا، لیکن افغانوں کے ہاتھ سے اصفہان کی غارتگری میں شیخ کے کتب خانہ کے دوسری کتابوں کی طرح یہ نسخہ بھی ضائع ہو گیا، اسکا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے، پروفیسر موصوف نے دوسری جگہ خاندان صفویہ کے عروج و زوال کی تاریخ سے بحث کرتے ہوئے علی حزن کے بعض خیالات کا (جو انھوں نے تذکرۃ الاحوال میں ظاہر کئے ہیں) جوئس ہینوس کی کتاب ”بحر اخضر میں برطانوی تجارت کی تاریخی سرگزشت“ اور کروسنسکی کی کتاب ”تاریخ انقلاب فارس“ کے نظریات سے موازنہ کیا ہے۔

اس ابتدائی عرصہ کے طے ہو جانے کے بعد اب میں یہ عنوان ذیل اُن واقعات پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جن کے متعلق حزن نے اپنے تذکرہ میں یا تو ذکر ہی نہیں کیا یا تفصیل سے نہیں لکھا، دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ شیخ حزن نے اپنا تذکرہ سلسلہ ۱۲ء میں ختم کیا اور مندرجہ ذیل واقعات مابعد کی تصنیف میں ملتے ہیں

شیخ زاہد بجیلانی کی شخصیت | اگلے اور اوراق میں لکھا جا چکا ہے، کہ شیخ نے اپنے اجداد کے سلسلہ میں زاہد بجیلانی کا تذکرہ کیا ہے اور اسکے متعلق مزید واقعات نہیں لکھے، تذکرہ نویسوں نے بھی عموماً اس طرف توجہ نہیں کی، صرف براؤن کی کتاب لٹریچر آف پرسیا جلد ۳ اور مجمع الفہائیس جلد اول میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے شیخ صفی الدین اسحق بن شیخ امین الدین جبریل الموسوی، سلسلہ صفویہ (حکمرانان فارس) کے مورث اعلیٰ تھے، آپکا نسب حضرت موسیٰ کاظم سے ملتا ہے، آپکا وطن اردبیل تھا، حزن کے جد امجد حضرت شیخ زاہد بجیلانی حضرت صفی الدین کے پیروم شاہ تھے

۱۵۰۰ عفات العاشقین مصنفہ تقی اوحدی البلبانی (قلمی نسخہ اردبیل لائبریری پٹنہ) ہفت اقلیم امین احمد رازی (قلمی) ۱۵۰۰ اردبیل کا بانی کیانی خاندان کا مشہور بادشاہ کچر بن کیکاؤس ہے یہ شہر کوہ سیلان کے دامن میں واقع ہے، یہاں آب دہوا بہت سرد ہے، یہاں کوہ سیلان سے پانی آتا ہے، جو بہت ہاضم ہو کر تلے، یہی وجہ ہے کہ یہاں کے آدمی بڑے کھانپوالے ہوتے ہیں، یہاں کے اکثر باشندے مذہب شافعی کے پیرو اور شیخ صفی الدین کے مرید ہیں کوہ سیلان کے اوپر ایک مضبوط قلعہ ہے، جسے ”در بہمن و دروین“ کہتے ہیں، فردوسی شاہنامہ میں لکھتا ہے کہ جب کچر و دروین بادشاہی کیلئے نزاع ہوا تو اسی قلعہ کی فتح پر فیصلہ قرار پایا فراز اسے فتح نہ کر سکا کچر نے فتح کر لیا اور بادشاہی اسی کو ملی

(نزہت القلوب حمد اللہ المستوفی قلمی نسخہ)

چنانچہ خان آرزو یا تقی اوحدی نے جہاں اپنے تذکرہ میں شیخ صفی الدین کا ذکر کیا ہے، وہاں یہ لکھا ہے، کہ گو تاریخ سے ثابت نہیں کہ اپنے شعر گوئی کی ہو لیکن (یہ) اشعار آپ کی طرف منسوب ہیں اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حنین کے جد امجد حضرت زاہد ابجیلانی کی کیا شخصیت تھی؟

حنین کا موطن آبائی اور اسکی جغرافیہ حالت

شیخ ”اصفہانی“ مشہور ہیں لیکن آپ کا آبائی موطن لاهیجان تھا، جسکی تصریح گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے، شیخ ”سنن تذکرۃ الاحوال“ میں صرف یہ لکھا ہے کہ یہ گیلان کے شہرون میں سے ایک شہر ہے، لیکن عوام کو خود گیلان کے متعلق بھی کم واقفیت ہے، لہذا ضروری ہے کہ گیلان کے جغرافیہ حالت کے متعلق چند سطور لکھ دیئے جائیں صاحب عجائب البلدان لکھتے ہیں:-

”گیلان ولایتیست نزدیک بہ قزوین و بحر خرد در جانب شمال آنست رود ہا و اشجار ہا بسیار دارد و باران بسیار شود، و گوئید تا چہل شبانہ روز آنجا باران منقطع نہ شود و چون باران بسیار شود در شب بانگ شغال بشنوند و بعد از ان بانگ سگ، مردم یک دیگر را بشارت دہند بہ انقطاع باران و این بسیار بہ تجربہ معلوم شدہ است“

عجائب البلدان میں لاهیجان کا تذکرہ نہیں پایا جاتا، لیکن امین رازی نے ہفت اقلیم میں گیلان کے ماتحت لاهیجان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

گیلان ایک ولایت ہے، جسکے اطراف میں پہاڑ یوں کا ایک سلسلہ ہے، وہاں تقریباً تین ماہ تک پانی برستے، یہاں کے لوگ اپنی اصطلاح میں دریا کو ”سپید رود“ کہتے ہیں اور چونکہ سپید رود گیلان کے درمیان میں جاری ہے، اسلئے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے، ایک حصہ کو ”پیشہ پیش“ اور دوسرے کو ”پیشہ پس“ کہتے ہیں۔ سابق الذکر حصہ کا دار الملک لاهیجان ہے جو ایک آباد اور گنجان شہر ہے، دوسرے حصہ میں شہر رشہ آباد ہے، جسے زشت بھی کہتے ہیں۔

اسکے بعد امین رازی نے وہاں کے طرز معاشرت کے متعلق ایک مختصر تبصرہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ وہاں کی لڑکیاں بڑی شوخ اور طنز ہوا کرتی ہیں، اور بازاروں میں ایک ادائے بے باکانہ کیساتھ محو خرام ناز رہتی ہیں، جب کوئی شخص کسی لڑکی کا خواستگار ہوتا ہے، تو وہ پھر بازار میں نہیں آتی، مولانا گیلانی فرماتے ہیں:-

دخترانے کہ ساکن رشہ اند ہچون طاؤس بہت می گردند
طلب مشتری بہ ہر بازار بند تنبان بہت می گیرند

شاہی وظیفہ اور ملاقات حزمین کیلئے محمد شاہ کی تشریف آوری

حزمین نے اپنے تذکرہ میں کہیں یہ واقعہ نہیں لکھا اسکے راوی صرف ایک کرہ نویس، غلام ہمدانی متخلص بہ مصحفی ہیں، انکے علاوہ کسی دوسرے تذکرہ نویس نے اس واقعہ پر روشنی نہیں ڈالی، حزمین دہلی میں عمدة الملک امیر خان کے دولتکدہ پر پھیرے ہوئے تھے اسوقت خود محمد شاہ حزمین سے ملنے آئے لیکن حزمین نے ملنا پسند نہ کیا۔

بارہا فردوس آرامگاہ خواستند کہ آن بزرگ، رایش خود طلبیدہ خطے از کلام و سہ بردارند ز ہمار قبول نہ کرد، چون استغنائے مزاج و سہ بر باد شاہ عالم پناہ با حسن وجہ ہویدا شد خود یک دو بار سوار شدہ قصد منظر کاہش کرد شیخ از آمد آمد اطلاع یافتہ بہ بہانہ بہ زیارت خواجہ قطب الاقطاب بختیار کاکی پیش از آمدن پادشاہ سوار شدہ در رفت چون کہ چنین اتفاق افتاد ملاقی الطرفین فیما بین صورت نہ گرفت با لآخر بہ سبب منادی کشتن از زبان سخن چینیان و غوغائے حریفان از دہلی بر آمدہ در بنارس رفتہ کنج عزت اختیار نمود۔

ایک دوسری روایت احمد علی ہاشمی سند یہ بیان کرتے ہیں، عمدة الملک نواب امیر خان خبر مقدم شیخ یافتہ برائے ملاقاتش رفت و شیخ را بہ نیاز تمام مہمان خود ساخت، خدمت نیکو بہ تقدیم رسانیدہ ملازمت پادشاہ کنایتہ جاگیر مبلغ پچھل ہزار روپیہ نزدیکی اکبر آباد پرانیش گرفت از مردم ثقہ شنید کہ پادشاہ مزبور مبلغ پنج لک روپیہ بہ معرفت نواب مزبور بہ شیخ عطا فرمودہ۔

لیکن ساتھ ہی مجمع النفائس میں سراج الدین علی خان آرزو لکھتے ہیں، در وقتیکہ عمدة الملک امیر خان بہادر مرحوم از آباء بہ حضور آمد شیخ بہ توقع قدر شناسی ربح القہقری نمودہ بہ شاہجہان آباد باز آمد و چند گاہ دیگر مثل کیمیا و عنقا متوازی درین شہر بود و غرض گمانی اشتیاق افزائی مردم است و بس چون بختش مدد اقبال یادری کرد عمدة الملک قریب بست لک دام جید از پادشاہ برائے او گرفت پس جمعیت می گزید۔

ان تینوں مختلف روایات کی تطبیق بہ ظاہر بہت مشکل ہے، نہ معلوم مصحفی نے یہ واقعہ کہاں سے لیا، حزمین نازک مزاج سہی لیکن ایسے بے نیاز نہ تھے، کہ پادشاہ تشریف لائیں اور وہ ملاقات سے اعراض کرین یہ تو ایک تارک الدنیا درویش کر سکتا ہے، نہ کہ ایک شاعر، ہاں خسرو دہلوی نے درباری تعلق سے علیحدگی کر لی، خاقانی نے منوچہر شروان شاہ کی ملازمت ترک کر دی، لیکن یہ ہوقت جب محبت الہی کا جوش پیدا ہوا اور عزت نشینی کی طرف طبیعت مائل ہوئی، حزمین کی زندگی نے ہنوز یہ پہلو اختیار نہیں کیا تھا، لہذا

لہذا عمدتاً یہاں حزمین انرا ب جہاد اول (قلمی) لکھ مجمع النفائس جلد اول ۱۰۵ تاریخ فرشتہ ۵۵ صفحہ ابراہیم

مصنفہ عزت الملک غلامی بہ خلیل (قلمی)۔

معلوم ہوتا ہے، حزن نے ثقہ شخص سے روایت نہیں لی، اسکے علاوہ صاحب مخزن الغرائب سے اسکی تردید بھی ہو جاتی ہے، چونکہ حزن عمدۃ الملک سے ملے انکے بیان ٹھہرے، انھوں نے بادشاہ سے ملایا، دربار سے وظیفہ دلایا، خان آرزو کی روایت سے طنز کی ہو آتی ہے، جو رشک سے خالی نہیں، خان آرزو کے نزدیک شاہجہان آباد میں حزن اسلئے آئے کہ امیر خان قدر کرنگے حالانکہ صاحب مخزن الغرائب کی روایت بھی یہی ہے، لیکن انھوں نے اسی واقعہ کو دوسرے پہلو سے بیان کیا ہے، اور خان آرزو نے اپنے جذبہ عناد میں واقعہ پر دوسرے پہلو سے روشنی ڈالی ہے، جس سے حزن کی خفت اور سبکی مقصود ہے، حزن دوبارہ شاہجہان آباد میں آئے ضرور لیکن یہ کیا ضرور ہے، کہ امیر خان کی قدر شناسی ہی کی امید میں آئے معلوم ہوتا ہے، امیر خان نے جو قدر شناسی کی وہ خان صاحب موصوف کو گران گزری اور آپکا یہ جذبہ ایک رشک آمیز حسرت کیساتھ اس ادائے بیان سے ظاہر بھی ہوتا ہے،

”چون نختش و اقبال یادری کرد عمدۃ الملک قریب بست لک دام جید از بادشاہ برائے اد گرفت پس جمعیت می گزرائید“

آخری جملہ میں جو جذبہ کارفرما ہے، ارباب بصیرت سے مخفی نہیں، اگر امیر خان حزن سے ملے انہیں اپنا مہمان کیا بادشاہ سے انکی ملازمت کرائی، وظیفہ مقرر کر دیا تو اس سے یہ نتیجہ کمان نکلتا ہے، کہ حزن ایک گداگر کی طرح ہاتھ پھیلائے ہوئے دہلی دوڑے آئے، خان آرزو ایک بڑے پایہ کے ادیب اور مستند راوی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ واقعہ انھوں نے یوں بیان کر دیا کہ دوسرے تاریخی روایات سے تضاد نہ ہو لیکن نتیجہ ایسا نکالا، کہ عوام میں غلط فہمی پیدا ہو جائے، احمد ہاشمی کی روایت کا بھی ٹھنک وہی ہے، جو خان آرزو نے لکھا ہے لیکن استنتاج میں دونوں نے دوراہین اختیار کی ہیں

ہندوستان کی ہجو اور ارباب کمال سے معرکہ آرائی | گزشتہ اوراق میں میں شیخ کے ان ہجو یہ خیالات پر روشنی ڈال چکا ہوں جو انھوں نے تذکرہ میں ہندوستان اور اہل ہندوستان کے متعلق ظاہر کئے تھے، قیاس اور رائے کی بنا پر انکے اسباب پر بھی ایک حد تک روشنی ڈال چکا ہوں، والدہ واغستانی اور خان آرزو نے اسکے متعلق شرح و بسط سے بحث کی ہے، میں نے صرف قیاس پر اعتماد کر کے نتیجہ نکالا تھا، عجیب اتفاق ہے کہ بعض واقعات کی تائید جنکے ماتحت مینے بحث کی تھی، تذکرہ میں سے بھی ہو جاتی ہے، مینے تین عنوان کے ماتحت بحث کی تھی، لسانی انقلاب، سیاسی پیچیدگی اور مذہبی اختلاف،

صاحب جمع النفایس لکھتے ہیں:-

”کیسے چنانکہ قدر اور بود در ان وقت نہ شناخت۔ نادر شاہ در دہلی مسلط شد۔ ہ بود و شہر دہلی بہ تصرف

تسون اور آمدہ، (حزن) در گوشہ خزیدہ بود بعد رفتن افواج شاہی باز ظاہر شد

پھر فرماتے ہیں:-

”از بسکہ طبع نامسازی دارد دین و غربت بزد کیسان است“

میرے ایک عنوان سیاسی پیچیدگی کی تو خان آرزو کے خیال سے تائید ہو گئی خان موصوف نے دوسری وجہ یہ بتائی ہے کہ شیخ خشک طبع، اور نامتسار تھے ہی اسوجہ سے لوگ انکی طرف زیادہ متوجہ نہیں،
خان آرزو نے یہ خیال کسی معاندانہ جذبہ میں نہیں ظاہر کیا ہے بلکہ والدہ و اعسانی بھی جو شیخ کے دوست اور ندیم تھے،
فرماتے ہیں:-

بادشاہ و امرا و سائر ناس کمال محبت و مراعات نسبت بہ دے مرعی می دارند لیکن از انجا کہ مروت جلی و انصاف
ذاتی شیخ است عموم اہل این دیار از بادشاہ و امرا وغیرہ ہجو ہائے رکیک کہ لایق شان شیخ نہ بودہ، نزدہ ہر چند
اور ازین ادائے زشت منع کردم فایده نہ بخشید و تا حال در کار است لا بد پاس نمک بادشاہ و حق صحبت امرا
و آشنایان بے گناہ گریبان گیر شدہ ترک آشنائی و ملاقات آن بزرگوار نمودہ

روایت بالا سے ظاہر ہے کہ والدہ و اعستانی کے نزدیک بھی شیخ ایک بے مروت انسان ہیں اور انھوں نے نہایت بے انصافی
کے ساتھ ہندوستانیوں کی مراعات کا یہ جواب دیا، کہ ہجو کہنے لگے، والدہ و اعستانی نے انھیں اس سے منع کیا لیکن شیخ اس پر بھی باز
نہیں آئے، آخر کار والدہ کو بھی اسکا رنج ہوا، اور انھوں نے شیخ سے ترک تعلق کر لیا، چنانچہ اسپر خان آرزو نے چٹکی لی۔ فرماتے ہیں:-
... عالی جاہ خان شفقت نشان علی قلی خان داغستانی کہ معتقد و مخلص حزمین است و حالا سورہ برآہ

دوستی شیخ حفظ کردہ۔۔۔۔۔

والدہ اور خان آرزو کے خیالات کی تائید، خود شیخ کے ملفوظات اور کلام سے بھی ہو جاتی ہے، چنانچہ جہان اپنے والد کی وفات
کا تذکرہ فرماتے ہیں وہاں انکی اس وصیت کو بھی نہایت اہمیت سے لکھا ہے، کہ ”ہر چند اوصاف دنیا را بردفق مرام نہ بینی تبعیت
و دنیا را روی اختیار نہ کنی“ عالم سے بے نیازی، خلق ظاہری کی افسردگی زود درخی، بے محابا اظہار خیال یہ تمام باتیں شیخ کی سیرت
میں داخل تھیں، جسکا ایک پہلو مفصلہ ذیل اشعار سے بھی نمایان ہو جاتا ہے،

سریف عیش جہان بے دماغ می ماند پیالہ می رود از دست و دماغ می ماند
بہ سفلہ عالم افسردہ باد از زانی خزان چون گشت گلستاں بہ زراغ می ماند
زخوئے آتش عشق غیور بواجبی است کہ آشیانہ ببلبل بہ باغ می ماند
ہندوستان اور اہل ہندوستان پر عمومی حیثیت سے شیخ نے جو اپنے ہجو یہ خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ایک حد تک مفصلہ
ذیل اشعار میں بھی موجود ہے

بہ ہند گشتہ زمین گیر نہا توانی ما رسیدہ است بہ شب روز زندگانی ما

سواد ہند خاطر خواہ باشد بے کمالاں را نماید خانہ تار یک روشن چشم عریان را

ز ہند تیرہ دل چون شمع روشن گریزدون رفت
نہ گشت آلودہ پستی ہمت دامن پاکم
بہ من نگذاشت دوران سبک سرفوت پائے
چون شمع بزم کوران تائیکے بیہودہ بگذازم
بیائے خود باین بزم آدم از سر بردن رفت
ازین عالم چون خورشید بلند اختر بردن رفت
چون موج از سینہ زین دریائے بے لنگر بردن رفت
حزین از کشور گردون دون پر و ز بردن رفت

صرف ہی نہیں بلکہ عمومیت سے گزر کر شیخ نے ذاتی حملے بھی کئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ خان آرزو نے ایک سالہ سہمی تہنیا انفاقلین لکھا اور شیخ کے کثیر التعداد اشعار کے نقایص لفظی و معنوی پر عالمانہ بحث کی چنانچہ والد داغستانی لکھتے ہیں۔

بعض از غیوران این مملکت کم انتقام بستہ، تیغ بجای بروئے کشیدہ در نظر ارباب خرد خفیفش کردند، از
جملہ سراج الدین علی خان آرزو کہ از شعرائے این شہر است و در فضیلت و سخنوری گوئے از میدان ہمکنان
می رباید اشعار غلط بسیار از دیوان شیخ بر آوردہ رسالہ سہمی تہنیا انفاقلین نوشت و ابیات مزبور ایک یک
ذکر کردہ تعریضات نمودہ

اسی طرح میر محمد عظیم ثبات ابن میر افضل ثبات نے شیخ کے دیوان سے بروایت والد داغستانی پانچ سو اور بروایت خان آرزو
دو سو ابیات نقل کئے اور ان کے مقابلہ میں متقدمین کے اشعار پیش کر کے بتایا کہ شیخ نے سرقہ کیا ہے ان میں زیادہ تر صائب کے اشعار
پائے جاتے ہیں جنہیں میر عظیم ثبات نے حنین کا ماخذ قرار دیا ہے، اسکی رویداد و طریقہ سے بیان کی جاتی ہے، والد داغستانی کا بیان
ہے کہ کسی شخص نے ایک موقع پر میر افضل ثبات کا کوئی شعر لکھ کر شیخ سے پوچھا، شیخ نے جواب دیا کہ مضمون جو گرا ہوا ہے وہ تو
در کنار ہے، یہ فلان شاعر کا خیال ہے، جس سے میر افضل نے سرقہ کیا ہے، میر عظیم نے یہ رقعہ دیکھ لیا انکی رگ حمیت جوش میں آئی
اور انھوں نے بھی شیخ کے کلام کی نظیریں پیش کیں، اور بتایا کہ ان میں فلان فلان متقدمین سے سرقہ کیا گیا ہے، لیکن خان آرزو
فرماتے ہیں کہ جب نواب شیر افگن خان پسر غیرت خان، میر محمد افضل کی شاگردی میں داخل ہوئے تو انھوں نے نگینہ میں یہ

۱۷۶۶ء میں شیخ نے سفر ہندوستان کیا، اور نشانی میں وفات پائی، یہ درمیانی زندگی ہندوستان میں گزری تاریخ سے پتہ
نہیں چلتا کہ انھوں نے ہند سے فارس کا سفر کیا ہو، لیکن براؤن نے بلفور کے ترجمہ ”مذکرۃ الاحوال“ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حنین نے
تہیہ کر لیا تھا کہ فارس کے سیاسی انقلاب اور اختلال کے باوجود، ہند سے لوٹ جائیں، لاطری ہسٹری آف پرشیا جلد تین ورتی
چونکہ مینے تذکرہ الاحوال ۱۷۵۵ء میں تمام کیا لہذا نتیجہ نکلتا ہے، کہ یہ اشعار اسی زمانہ میں کہے کیونکہ اسکے بعد وہ فارس جانیکے بجائے فارس
میں چلے گئے تھے ریاض الشراۃ خان آرزو نے صرف تذکرہ کر دیا ہے، لیکن ریاض الشراۃ میں یہ اشعار بھی مندرج ہیں یہ ریاض الشراۃ

مصرعہ کندہ کرایا تھا۔

شیر افکن خان مرید ثابت دوست

جب میر افضل کا انتقال ہو گیا تو خان موصوف نے شیخ علی حزمین کی شاگردی اختیار کر لی اور ایسے معتقد ہوئے کہ خان آرزو لکھتے ہیں ”اعتقاد ہے کہ مافوقش تصور نبودہ ہم رسانید“ یہی وجہ ہوئی کہ میر محمد عظیم نے تعصب میں آکر شیخ کے کلام پر رد و قدح کی اور دو سو ابیات کو متقدمین کے کلام کا مسروقہ بتایا، شیخ نے اہل کشمیر پر بھی تعریفیں کیں، چنانچہ وہ بھی شیخ سے کچھ اور انھوں نے مقابلہ کے لئے ملا ساطع وغیرہ کو مستعد کیا۔

خان آرزو کی تنبیہ الغافلین پر ایک سرسری تبصرہ | خان آرزو نے جب تنبیہ الغافلین لکھی شیخ دہلی میں تھے، اور یہی وجہ ہے کہ خان آرزو کا لب و لہجہ بھی ایسا نرم تھا، گویا وہ شیخ

کے سامنے مودبانہ بیٹھے ہیں، اور اپنے شکوک رفع فرما رہے ہیں کہا جاسکتا ہے کہ خان صاحب موصوف کا بہ حسن اخلاق تھا کہ انھوں نے یہ ادائے بیان اختیار کیا لیکن میں کہوں گا کہ نہیں یہ شیخ کے کمالات کا رعب اور اسکی شخصیت کا اثر تھا اور یہ خیال اس واقعہ سے اور بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے، کہ خان آرزو مجمع النفائس لکھ رہے تھے اسوقت شیخ یارس میں اقامت گزین ہو گئے تھے جب بارعب حریف سلنہ سے ہٹ گیا اور اسکی ہیبت کا اثر دل سے کم ہو گیا تو خان صاحب موصوف کے خیالات میں ایسی جرأت آگئی کہ گویا وہ حزمین کو ایک ناقابل التفات چیز تصور کرتے ہیں اگر حسن اخلاق کے اثر سے خان صاحب نے تنبیہ الغافلین میں اس ظاہر دارانہ استرشاد اور ملمع آمیز انکسار کا اظہار کیا تھا تو اسکا موقع ہر وقت تھا، خان صاحب نے مجمع النفائس میں حزمین کے متعلق جو ادائے بیان، اظہار خیال، لہجہ طنز اختیار کیا ہے اسے دیکھنے کے بعد خان صاحب کے ساتھ تنبیہ الغافلین کے دیباچہ کی نسبت اتہام سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی یا پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حزمین ایسی بارعب شخصیت رکھتے تھے کہ انکی موجودگی میں خان آرزو جیسے بلند پایہ شاعر اور نکتہ رس عالم بھی ”حریف جوشش دریا نہیں خود داری سائل“ کا مصداق تھے۔

خان آرزو تنبیہ الغافلین کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

”درین ایام مطالعہ دیوان بلاغت بنیان جناب فصاحت مآب شعرائے اوج نکتہ پردازی دبیر فلک سخن سازی
بقیۃ السلف حجۃ الخلف، نتیجہ متقدمین و خاتم متاخرین شیخ محمد علی متخلص بہ حزمین کہ تخمیناً از مدت ده سال بہ سبب
ہنگامہ ایران وارد ہندوستان جنت نشان کہ داخلش مکن و خدکم کان اصنا گویان است گردیدہ از طغیانہ عیش
گوش اکابر و اصاغر پر گشتہ اتفاق افتاد، استفادہ تمام دست تہیم داد لیکن در بعض اشعار کہ بہ سبب قصور ذہن
بہ معانی آن نرسیدہ، و ذانیہ بہ مقصد آن نہ گردیدہ، ترددی رودادہ ناچار در تحریر آن را بروئے قلم مشوش رقم خود

ملہ مجمع النفائس ص ۱۲ مخزن الغرائب ۱۲

کشادہ و نیز بارہ از مصارع شعر را که از نارسائی فہم خویش نارسا فہمیدہ گاہے باندک تغیر و تبدیل گردانیدہ و گاہے خود گفتہ، پس این از عالم خطائے بزرگان گرفتہ کہ در واقع خطائے بزرگیت تصور نباید فرمودہ امید کہ اگر بہ نظر شریف او در آید از خلل و زلل بر آید

اسکے مقابلہ میں مجمع النفائس کے ان طنزیہ اور تند فزون کو ملاحظہ فرمائیں جو جستہ جستہ خان آرزو نے لکھے ہیں، چند گاہ دیگر مثل کیمیا و عنقا متوازی این شعر بود و غرض از گنہامی، اشتیاق افزائی مردم است و بس رسالہ مشتمل بر حسب و نسب و سیر و شعر خود نوشتہ دعویہائے بلند در ان نمودہ کہ صاحب داعیہ از ان معلوم می شود در نیو لایہ عزم حج و زیارت عقیبات کہ روانہ نہ گاہ شدہ بود، از عظیم آباد برگشتہ بہ بنارس کہ معبد عظیم ہندوان است فروکش کشتہ

ترسیم کہ بہ کعبہ نہ رسی اے اعرابی کین رہ کہ تو میردی بہ ترکستان است

..... شیخ گوید کہ این دیوان کہ شہرت دارد دیوان چارم است و سہ دیوان در فترت افغانہ مذکور شد بہر حال دیوان مذکور ہم کہ مکرر بہ مطالعہ در آمد بہ آن وجہ کہ مظنون نتیقن شیخ و جماعت نصیریان دوست نیست اگر این ہم بہ آن سہ ملحق می گردید، مورد این ہمہ اعتراضات نمی گردید می گویند کہ شیخ مذکور فاضل است و صاحب تصانیف لیکن ہیج از دور علم حکمت و کلام بہ نظر در نیامدہ

نتیجہ ظاہر ہے، ساتھ ہی خان آرزو نے شیخ کے حکمیہ اور کلامیہ تصنیفات کے متعلق اپنی لاطینی کا اظہار کیا ہے، ممکن ہے حکمت اور کلام کے متعلق شیخ کی کوئی تصنیف انکی نظر سے نہ گزری ہو، لیکن ان فنون کے اوپر یقیناً انھوں نے تصنیفات چھوڑی ہیں جنکا مختصر حال اپنے ”تذکرۃ الاحوال“ میں بھی درج کر دیا ہے، شیخ کے بارہ رسائل کا ایک مجموعہ پٹنہ کی اورنٹیل لائبریری میں موجود ہے، جس میں رسالہ ”حدوث و قدم“ رسالہ صیدیہ، رسالہ فرسنامہ، شرح قصیدہ لامیہ، رسالہ معاد وغیرہ ہیں، متذکرہ بالا رسائل پر مبنی ایک سرسری نظر ڈالی ہے، اور مجھے شیخ کے کمالات علمیہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے

خان آرزو نے حزمین کے کلام پر جو جرح کی ہے، وہ بعض جگہ صحیح بھی ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ شیخ ایک قابل اور تکتہ رس شاعر نہ تھے، شیخ کی شاعری ملہانہ تو تھی نہیں، کہ انکا کلام لفظی اور معنوی ربط، اصولی اور فروعی قیود تحلیلی اور منطقی دقیقہ سنجیوں کے اعتبار سے ذرا برابر بھی گرا ہوا نہ ہوتا سرخوش اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ صاحب تبریزی نے بابا افغانی کے مندرجہ ذیل شعر کے مصرعہ اول پر تصریح کیا،

چو شبنم صبح دم نالان ز گلگشت چمن رفتم نہادم ردے بردے گل از خوشن رفتن رفتم (رفغانی)
صائب نے کہا ”بجائے ”نالان“ بہ مناسب ”شبنم“ لفظ گریان“ باید اگر مصرعہ اول را بہ این طور خواند خوب است

لہ ریاض الشعراء مجمع النفائس سہ فہرست کتب قلمی فارسی اورنٹیل لائبریری پٹنہ (۱۶۵)

چو شبنم صبح دم گریان گلگشت چمن لہ فتم آئے

اسی طرح حنین نے اپنے تذکرہ میں ملاحظہ کاشی کے جس شعر کے اوپر اپنے والد کی جرح کا حال لکھا ہے وہ اگلے اور اقل میں لکھا جا چکا ہے، ملاحظہ کاشی عہد صفویہ (فارسی) کے ایک زبردست اور بلند پایہ شاعر گزرے ہیں اور انکا وہ شعر جس پر حنین کے والد شیخ ابوطالب نے جرح کی ہے، اس قدر مشہور ہے کہ مورخین نے مختصر کے کلام کا نمونہ پیش کرنے میں اسے درج بھی کیا ہے، ہر چند شیخ ابوطالب کی جرح اس اعتبار سے صحیح ہے، کہ انکے نزدیک شعر صحیح طور پر نہ پڑھا گیا، ”تقامت بلند قدان در کند تو“ لوگوں نے پڑھا تھا، حالانکہ مختصر کاشی کے اصل شعر میں ”تقامت بلند“ کی جگہ ”گردن بلند“ ہے اور صرف اس ایک لفظ ”تقامت“ اور ”گردن“ کے رد و بدل سے لطافت معنوی میں آسمان زمین کا فرق ہو گیا ہے، گردن بلند، کو ملحوظ رکھنے کے بعد ابوطالب کی جرح کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

الغرض جرح سب پر ہو سکتی ہے، تنقید آسان ہے، لیکن سخن آفرینی مشکل چیز ہے،

حزین ۱۔ ظلمتکہ عاشق را از چہرہ منور کن تا چند بروز آرم تاریکی شبہا را

آرزو ۱۔ شب بروز آرد دن صحیح است نہ تاریکی شب بروز آرد دن با شبہائے تاریک می بایست گفت

یہاں تجھے آرزو سے اتفاق ہے، اصل محاورہ یہی ہے جو خان آرزو نے لکھا ہے، رات سے دن ہوتا محاورہ صحیح ہے تاریکی شب سے دن ہونا محاورہ نہیں،

حزین ۲۔ ہر چہ خواہی مکن از دوری دیدار مگو وحشت آباد مکن خاطر ویرانی ما

آرزو ۲۔ وحشت آباد کردن خاطر ویران چہ لطف دارد اگر خاطر جمع یا خاطر آبادی بود گنجایش داشت و اگر گوئید کہ عاشق را با جمیعت خاطر چہ کار گوئیم درینجا معشوق مخاطب است و خطاب جز در حالت وصل صورت نمی بندد و جمیعت خاطر در وصل متصور است۔

اس شعر میں خان آرزو نے جرح تو صحیح کی لیکن تمثیل میں نفسیاتی اعتبار سے خود غلطی کر رہے ہیں خان صاحب نے یہاں تک صحیح فرمایا، کہ خاطر ویران کو وحشت آباد کر نیکی تمثیل ایک فضول چیز ہے ویرانہ تو خود ہی وحشت آباد ہوتا ہے اسکے بعد یہ فرماتے ہیں کہ ”میرے قول پر یہ جرح ہو سکتی ہے کہ عاشقوں کا دل تو خاطر جمع ہوتا نہیں تو میں یہ کہوں گا کہ اس شعر میں معشوق مخاطب ہے، اور خطاب صرف حالت وصل ہی میں کیا جاتا ہے، لہذا اول کو خاطر جمع کہنا مناسب تھا“ خان صاحب نے ”خاطر جمع“ کی اصلاح دیکر، اور اس جرح کو اپنے سرفرض کر کے البتہ خود کو مجرور کر لیا ہے، ورنہ انکی جرح اپنی جگہ پر صحیح تھی، خان موصوف صرف یہ کہہ سکتے تھے کہ ویرانہ کو وحشت آباد کہنا صحیح ہے اور بس بات ختم تھی اب انھوں نے جرح کو طول دیا، اور فرماتے ہیں ”خطاب وصل میں ہوا کرتا ہے، اور اسوقت ”خاطر ویران“ کی جگہ حنین ”خاطر آباد“ کہہ سکتے تھے“ لیکن ظاہر ہے کہ

لے مجمع النفایس لہ مخزن الغرائب

خیالات اور نفسیات کی دنیا میں خان آرزو کے نظریہ کے خلاف بھی ہوا کرتا ہے، اگر وہ تصور کی نیرنگیوں خیال کے التباسات، مراقبہ کے مظاہر، جذبہ رسا اور شوق ناپیدا کنار کے رموز پر غور کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ بحرین بھی وصل کا لطف آتا ہے، اور چونکہ نفس ایک طرف ملال ہجر سے متکیف اور دوسری طرف وصل خیالی کی لذت آفرینیوں سے لذت اندوز ہوتا رہتا ہے، اسلئے مشوق کو مخاطب کر کے بھی ”خاطر ویران“ کا شکوہ ادا کیا جاسکتا ہے

حزین:- ازہمت سرستان بردار حزین خضرے تنہا نتوان رفتن صحرائے محبت را

آرزو:- ”خضر برداشتن“ عبارت تازہ است خضر از عالم زاو نیست کہ بردارند و گر گویند کہ ”رفیق برداشتن“ در محاورہ آمدہ گوئیم ہمراہ ”برداشتن“ است نہ تنہا ”برداشتن“ و بر تقدیر تسلیم خضر در حکم رفیق نیست یعنی استعمال این لفظ در حق بتووع جائز نیست

یہاں خان آرزو کے دو اعتراض ہیں، ایک لفظی دوسرا معنوی جب وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ”خضر برداشتن“ بہ مندرجہ ”رفیق برداشتن“ ہے، اور زبان کے اعتبار سے اس میں کوئی نقص نہیں تو اب ان کا یہ اعتراض ہوتا ہے، کہ لفظ خضر کے ساتھ ہی ”بردار“ بھی ہونا چاہئے، تھا خضر اور ”بردار“ کے درمیان میں دو ایک لفظ کا حائل ہو جانا ظاہر کرتا ہے کہ محاورہ زبان کے خلاف ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ نقص ہے جیسا کہ علماء بلاغت و معانی نے لکھا ہے، تو صرف حزین ہی اس کے مجرم نہیں بلکہ شیخ سعدی بھی اس کے مجرم ہیں، بوستان کا پہلا شعر ہے،

بنام جهان دار جان آفرین حکیم سخن بر زبان آفرین

یقیناً ”سخن آفرین“ ساتھ ہونا چاہئے، ورنہ ضعف التالیف کا الزام عاید ہوتا ہے، مگر جب سعدی جیسے بالکمال نے اسے منظور کر لیا تو حزین کے سر یہ عیب نہیں معلوم ہوتا،

خان صاحب موصوف کی دوسری جگہ معنی سے متعلق ہے، افسوس انہوں نے بے محابا یہ تو لکھ دیا کہ ”خضر بحکم رفیق نیست“ رفیق خود خضر کا متبوع ہے لہذا ”خضر بردار“ کا فقرہ متبوع کو بولنا جائز نہیں، اگر خان موصوف کا یہ منطقی استدلال کسی لفظ کا منت کش نہیں تو نعوذ باللہ یہی اعتراض قرآن مجید کے سروراد ہوتا ہے

الہو الی الملأ من نبی اسرائیل من بعد موسیٰ اذ قالوا لنبی لھم ابعث لنا ملکا لھم

یقیناً بنی اسرائیل متبوع تھے، اور ان کا بادشاہ ان کا محکوم نہیں ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی بنی اسرائیل ”ملک بردار“ کا فقرہ بول رہے ہیں، کہا جاسکتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا تھا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ ادھار اور حزین کے شعر سے خود ہی ”خضر برداشتن“ کا معنی پیدا ہوتا ہے، میں کہوں گا کہ ایسا نہیں یہاں ”ہمت سرستان“ کی قید لگی ہوئی ہے خان آرزو نے غالباً ”ہمت سرستان“ کا پایہ نہیں سمجھا، ”خضر برداشتن“ کے لئے ایک درمیانی کڑی موجود ہے جس طرح بنی اسرائیل کے ”العبث لنا ملکا“ کے لئے ”نبی“ کی درمیانی کڑی ہے، لہذا اس آیت سے خان آرزو کے اس خیال کا رد ہو جاتا کہ

”خضر در حکم رفیق نیست یعنی استعمال این لفظ (خضر برادر) در حق متبوع جائز نیست“

ایک اور شک یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کے انتخاب کیلئے کسی ذاتی شخصیت کی تعیین نہیں ہوتی اور خضر ایک متعین ہستی ہے لیکن میں کوئی شک کہ یہاں خضر مجاز ہی کی تلاش ہے، کہ صحرائے محبت میں رفاقت کا کام انجام دے ظاہر ہے کہ خضر حقیقی کو گستاخانہ وادی محبت میں رہنمائی کی تکلیف نہیں دی جاسکتی،

حزمین :- مانع نمی شود کف بے مایہ سیل را دامن حریف گریہ بے اختیار نیست

آرزو :- دامن را با کف بے مایہ نیست معذرتی در کلام بلغات راجع اثبات است اگر دامن را مداخلت در منع گریہ می بود نفی آن صحت می داشت چہ دامن پاک کننده اشک است نہ مانع گریہ

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ کف بے مایہ سے تو سیلاب شک ریزی رکتا نہیں، لیکن دامن بھی اس سیلاب کو جذب نہیں کر سکتا ظاہر ہے کہ جب انسان روتا ہے، تو پہلے کف دست اور انگلیاں بار بار آنکھوں پر پھیری جاتی ہیں جذبہ وافر ہے تو قطرات اشک ہاتھ سے گزر کر دامن پر چھلکنے لگتے ہیں، اور دامن تر ہو جاتا ہے، لیکن حزمین کہتے ہیں کہ میرا گریہ صرف یہی نہیں کہ کف بے مایہ سے نہیں رکتا بلکہ دامن بھی قطرات اشک کو جذب کر نیکی صلاحیت رکھنے کے باوجود میرے ”گریہ بے اختیار“ کا حریف نہیں، یعنی دامن سے بھی سیلاب اشک گزرنے لگتا ہے خان آرزو کا اعتراض یہ ہے کہ دامن اشک کو پاک کرتا ہے، گریہ کو روکنا اس کا کام نہیں، مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ”گریہ بے اختیار“ میں ہوتا کیا ہے، کیا گریہ کرتے کرتے انسان کی ہچکیاں بندھ جائیں اور ایک قطرہ بھی آنسو نہ نکلے، اگر ایسا ہوتا ہے تو کہہ سکتے تھے، کہ دامن کو حریف گریہ کہنا غلط ہے، لیکن جب یہ ہے کہ گریہ نام ہے سیلاب اشک ریزی کا تو پھر اعتراض ہی کیا ہے، غالب مرحوم نے بھی اس معنی میں ایک شعر کہا ہے،

مصرعہ - حریف جوشش دریا نہیں خود داری ساحل

خان آرزو کے اصول کے مطابق تو اسپر بھی جرح ہو سکتی ہے، چونکہ ساحل کو تو موج سے دو چار ہونا پڑتا ہے، ”جوشش دریا“ کا مقابلہ کیسا لیکن جب جوشش دریا اور موج خیزی لازم و ملزوم شے ہیں تو پھر کوئی جرح نہیں،

مہر چند خان آرزو کی بعض جرحیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں لیکن اکثر ایسی ہی ہیں کہ خود ان پر اعتراض عاید ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ دارستہ مل سیالکوٹی نے - - - - - رجم الشیاطین کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور خان آرزو کے اعتراضات کی بے سرو پائی دکھائی، میر محمد عظیم ثبات کے جو اعتراضات والدہ واغستانی نے ریاض الشعرائین لکھے ہیں، وہ ٹھیک وہی پہلو رکھتے ہیں جس کا نقشہ آج بیسویں صدی میں ”غالب بے نقاب“ کی رزم آرائیوں میں چھلک رہا ہے، اور میں اس مسئلہ پر اصولی حیثیت سے ”غالب بے نقاب کے حجابات“ (مطبوعہ نگار بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء) کے زیر عنوان بحث کر چکا ہوں،

شیخ کے تلامذہ اور قدر شناس | ملتے اگلے اور راق میں قیاسی طور پر یہ نتیجہ نکالا تھا کہ شیخ کے قیام (دائمی)

ہند کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ارباب جہل اور مخالفین کی تعداد کے باوجود ان کے قدر شناسوں کی ایک جماعت ہوگی جسکے اثر محبت نے آپ کو مجوس کنشت رکھا، اور تذکروں سے یہ بات ثابت ہوگئی، عمدۃ الملک امیر خان کے الطاف، بادشاہ کے وظایف، شیر افگن خان کی عقیدت، آزاد بلگرامی کے جذبات، شیخ آیت اللہ ثنائی جیسے بلند پایہ شاعر کا تلمذ یہ تین ایسی نہ تھیں جو شیخ کو گرویدہ نہ بنالیتیں

عبدالملک آروی

لہ جمع التفائیس - ۱۲۵ ید بیضا ۱۲۵ عقد ثریا ۱۲۵

علم کیمیاء کا ایک کامیاب پلٹ ہیر آمل

کہنے کو صرف تیل ہی لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے کیر کو بھی مات کرنا ہی یہ تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود بناتا ہے و کیمیاء کی جزاء سے جدید اصول پر تیار کیا گیا ہے جسکی تصدیق بڑے بڑے سائنس دانوں نے کی ہے اسکے فوائد کی تفصیل مختصر شہرہ میں نامکن ہے مختصر اویون سمجھ لیجئے کہ گھر میں اسکی بیشیشی کھنا گویا بہت مہنہ کو دفع کر دینا ہے اگر بڑے سر یا چند بچوں کے بال گر گئے ہین یا گر رہے ہین۔ یا باخوڑہ اور گنج ہو گیا ہے اگر بڑے نزلہ درد سر یا شقیقہ، دوران سر، ضعف دماغ و ضعف بصر بے خوابی یا نسیان کی شکایت ہے اگر بڑے سر اور جسم کی پھوڑیاں، پھنسیاں، گرمی دانے، خارش یا دیگر امراض جلدی کا دفع کرنا مقصود ہے اگر بڑے کٹھن مالاکسل اور دق وغیرہ سے محفوظ رہنا ہے۔

تو ان سب کا واحد علاج کامیاب پلٹ ہیر آمل ہے

جو نہ صرف خوشبو بلکہ اپنی مقدار و وزن کے لحاظ سے بھی بازار کے تمام خوشبودار تیلوں سے اچھا اور ارزان ہے ڈاکٹر بیج ہادر لکھنؤ نے اپنی تحریر میں تصدیق فرماتے ہین کہ اس تیل کے فوائد شہرہ کے مطابق پائے گئے ہین اور مرزا جعفر علی خان صاحب لی اے ڈی کلکٹر رائے بریلی نے دوامی آرڈر ہر ماہ ایک بیشیشی کا دیدیا ہے مولانا نیاز فرماتے ہین کہ یکم نیاز کے تمام گروے ہوئے بال از سر نو پیدا ہو رہے ہین اور بہت گھنے جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضروری ہے

قیمت معہ محصول (پتہ) بینجر کامیاب پلٹ ہیر آمل لکھنؤ
دوستیوں کے خریدار سے معہ محصول سے

مُصَوِّر کا نام شاہکار

(ایک فسانہ)

(۱)

نواب جمشید یار کی کوٹھی عین دریائے جن کے کنارے تھی۔ ایک طرف تاج اور دوسری طرف جتنا کی چادر سمین آنکھ کی فرحت اور دلی سرور کے لئے کافی سامان بہم پہنچاتے تھے نواب صاحب نے اس قطعہ کو صرف اسی نظارہ سے لطف اندوز ہونے کیلئے خرید لیا تھا۔ مین جس کمرہ میں ٹھہرایا گیا تھا وہ وسعت کے لحاظ سے گو مختصر تھا مگر میری ضروریات کے لئے بالکل کافی تھا۔

نواب صاحب کے ملازم نے بتایا تھا کہ یہ کمرہ خود نواب صاحب کی پرائیوٹ نشستگاہ کا کام دیتا تھا اسوجہ سے اسے نسبت دیگر کمروں کے زیادہ سجا یا گیا تھا۔ عمدہ فرنیچر قیمتی ساز و سامان اور دلکش آرائشی تصاویر سے کمرہ کی تزئین کی گئی تھی۔

کمرہ کے ارد گرد کھلی الماریاں رکھی ہوئی تھیں جن میں بیش قیمت کتابیں، قلمی دستاویزات و مکاتیب، رسالوں اور اخباروں کے قابل قریب سے سلسلہ وار رکھے ہوئے تھے۔ ہر الماری کے تحت پر اسکی فرست چسپان تھی جتنا مجھے یہ معلوم کرنے میں مطلق وقت نہ ہوئی کہ نواب صاحب کی تاریخی کتابیں کس الماری میں رہتی تھیں اور اسکی فرست کن کن کتابوں پر مشتمل تھی۔

نواب صاحب اپنے داماد شہریار بہادر کے ہمراہ شکار پر گئے ہوئے تھے اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں ان کے دولت کدہ پر انکی عدم موجودگی میں حاضر ہوا تھا لیکن ان کے خوش خلق ملازم جانتے تھے کہ میں ان کا عزیز ترین دوست ہوں اس لئے کوٹھی میں میری آمد کی خبر فوراً پھیل گئی اور ہر ایک نے مجھے گرمجوشی سے بیک کہا پھر نہایت پر تکلف کھانے کے بعد مجھے باعزاز اس کمرہ میں پہنچا دیا گیا جہاں کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

رات ہو چکی تھی مگر نہ معلوم دس بجے جانے کے بعد بھی مجھے کیون نہ نیند نہ آئی اس وجہ سے ارادہ کیا کہ بجائے پلنگ پر لیٹے لیٹے وقت ضائع کرنے کے کچھ دیر مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ غنودگی پیدا ہو جائے اس خیال سے پلنگ پر اٹھا اور تاریخ کی الماری کے قریب پہنچ کر ایک کتاب منتخب کی اور واپس آ کر پڑھنا شروع کر دیا۔

میرے لئے ایک دلچسپ موضوع کا باعث ہوئی اور میں اس کے متعدد صفحات پڑھ کر ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا زوال

بجد سرور ہوا۔ میری عادت ہے کہ دوران مطالعہ میں ہر پیر گراف کے بعد نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہوں تاکہ نگاہ کو آرام ملے۔ حسب عادت میں اس عمل کو کئی بار کر چکا تھا کہ ایک دفعہ میری نظر کتاب پر سے ہٹ کر ایک بیضوی تصویر پر پڑی جو میرے پلنگ کے عین مقابل دیوار کے وسط میں لٹک رہی تھی اور جسے اس وقت تک میں نے

(۲)

سبز جھالر کے برقی فانوس سے ہلکی ہلکی روشنی صرف میری کتاب پر پڑ رہی تھی اور کمرہ کا وہ حصہ جس میں تصویر لٹک رہی تھی گو کامل تاریکی میں تو نہ تھا مگر پھر بھی جھالر میں سے چھپکن چھپکن کر کچھ روشنی اسپر پڑ رہی تھی جو نہ میری نظر تصویر پر جا کر ٹھہری میں نے ہاتھ سے کتاب رکھ دی اور غور سے تصویر دیکھنے لگا تصویر ایک نوجوان حسین لڑکی کی تھی۔

تصویر کینوس (Canvas) پر بنی ہوئی تھی۔ صاحب تصویر کا چہرہ گردن، شانہ اور نصف سینہ دکھایا گیا تھا۔ بازو اور لمبے لمبے بال تاریک ”فضائے بعید“ (Distant Land) میں غیر محسوس طریقہ سے جذب کر دئے گئے تھے اور یہی وہ صنعت تھی جو تصویر کو جالب توجہ بنا دیتی تھی۔ تصویر کا فریم بیضوی تھا اور نہایت قیمتی مٹلا نقش و نگار سے مزین مصوری میں معمولی شد بد کے سوا مجھے اور کچھ لگاؤ نہ تھا مگر اس تصویر کی ظاہری کشش اور رنگوں کی آمیزش آنکھوں میں کچھ اس طرح کھٹی جا رہی تھی کہ بے اختیار جی چاہا کہ اسے قریب سے جا کر دیکھوں۔

چنانچہ میں پلنگ پر سے اٹھا اور تصویر کے پاس گیا۔ ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر اسے دیکھنا شروع کیا آنکھوں میں خمار بادہ کی سی مستی، رخساروں پر شہاب کی سی سرخی ایسی خصوصیات تھی کہ جنھوں نے مجھے کھوڑی دیر کیلئے مہوت بنا دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر اس تصویر میں کیا دلکشی تھی جو اس قدر جالب توجہ واقع ہوئی تھی۔ میں نے بہت سے بالکل مصوروں کے نقوش دیکھے تھے مغل، بنگال اور پہاڑی اسکول کے بہت سے بے نظیر نمونے میرے المیوں میں موجود تھے اور گو خود کبھی تصویر کشی نہ کی تھی مگر اوّل عمر سے تصویر اور نقاشی کا مداح تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ فن سے ناواقف ہونے کے باوجود بھی ہر اس تصویر کو اپنے پاس رکھ لیا کرتا تھا جو مجھے اچھی معلوم ہوتی تھی میں کسی خاص اصول یا قاعدہ کا پابند نہ تھا بلکہ صرف جاذب نظر تصویر میرا عام معیار تھا یہی وجہ تھی کہ میرے پاس کئی تصویریں ایسی تھیں جنھیں ماہرین قطعی مہموں بتاتے تھے مگر میں نے صرف اس وجہ سے رکھ چھوڑا تھا کہ وہ مجھے ”اچھی معلوم ہوتی تھیں“

لیکن ایسی تصویر کبھی نہ دیکھی تھی۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ آخر اس تصویر میں کیا خوبی تھی۔

کہ اس قدر مسحور کر رہی تھی۔ بہت دیر غور و تعمق کی نگاہ سے دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ تصویر کی حقیقی خوبی صرف یہ تھی کہ وہ بالکل جاندار معلوم ہو رہی تھی تصویر نے مجھے پہلے بہت مسرور کیا پھر حیرت ہوئی اور قہقہے برپا کیے یہ حالت قائم رہنے کے بعد میرے منہ سے ”واہ“ نکلا اور اسٹول پر سے اتر پڑا۔

(۳)

میں نے الماری کے قریب جا کر اس جلد کو تلاش کرنا شروع کیا جس میں تصاویر اور نقوش کے متعلق تفصیلی حالات درج تھے۔

کیا مسلمانوں کے تمام عقاید واقعی اسلامی ہیں؟

اس سے قبل ہم ایک مضمون میں بتا چکے ہیں کہ اسلام کو قومی مذہب بنانے میں کتنے نقصان ہیں۔ اور یہ بھی دکھلا چکے ہیں کہ مسلمانان ہند کی جماعت کسی معنی میں ”قوم“ نہیں ہے بلکہ ایک مذہبی جماعت ہے۔ ہم نے یہ بھی دکھلایا ہے کہ اس غلط خیال کی وجہ سے مسلمانوں کی تنظیم جماعت میں سخت ابتری پھیل رہی ہے۔

اس مضمون میں ہم صرف مذہبی نقطہ خیال سے اس مسئلے پر بحث کریں گے کہ مسلمانوں کے عام عقاید و اعمال میں کس قدر دراصل اسلام ہے اور کس قدر سیاست و معاشرت ملتی۔

ایک مسلمان کا بچہ جب پانچ یا چھ برس کی عمر کو پہنچتا ہے تو والدین کی پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے دینی تعلیم حاصل کرے محلہ کے میاں بچے پر دیا جاتا ہے۔ جو اسکو بغدادی قاعدہ شریعہ کراتے ہیں۔ اور اسکے بعد قرآن کا سارا متن دو تین سال کے اندر پڑھاتے ہیں۔ یہ گویا اولین مذہبی تعلیم ہے جو مسلمان کے بچوں کو دی جاتی ہے۔ ہندو کا بچہ اتنے ہی زمانہ میں مدرسہ میں داخل ہو کر واقعی علم حاصل کرتا ہے۔ لکھنا پڑھنا اور حساب سیکھتا ہے۔ اور مدارس ثانوی کے قابل ہو جاتا ہے۔ بدقسمت مسلمان کا بچہ قرآن کے ختم کرنے پر بھی چھوڑا نہیں جاتا۔ اگر گلستان بوستان کی نوبت نہ آئے تو بھی دو تین سال تک اور اسکو غیر مانوس علم و زبان میں درس حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ اگر وہ اسکول میں بھی داخل ہوا تو اسکولوں اور کالجوں کے نتیجے بر ملا کہہ رہے ہیں کہ تعلیمی تگ و پو میں مسلمان کا بچہ ہمیشہ پیچھے رہا کرتا ہے۔ یہ بہت ہی شاذ بات ہے کہ مسلمان کسی امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو جائے یا مائرس کی معلمین کی کرسیوں کا زینت ہو لیکن اگر آج کوئی مسلمان اپنا زبان سے یہ نکال دے کہ اس طرحی تعلیم سے کیا حاصل ہوا اور کیوں وقت ضائع کیا گیا تو مولوی ہاتھ مل کر کے رہیائے کہ افسوس آج اس مرتد کو سنگسار کرنے کا موقع حاصل نہیں ہے۔ لیکن آؤ ذرا ہم اسلام کے متعلق جانچ کریں کہ کیا واقعی یہ اسلام حقیقت میں وہی اسلام ہے جسکا حکم قرآن میں ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ دنیا میں اسلام کی کیا ضرورت تھی جبکہ پہلے یہود مذہب میں ہماری شریعت کی وہ ساری باتیں (کیا اعمال کیا اعتقاد) موجود تھیں یہود کا مذہب کیوں منسوخ اور نامقبول قرار پایا اور اسکی جگہ کیوں اسلام قائم ہوا۔ کون یہودی ایسا ہے جو خدا کے وحدہ لاشریک کا قائل نہیں یا انبیائے مرسلین کا۔ اگر کوئی مولوی موجودہ اسلامیت اور یہودیت میں فرق دکھلا دے تو میں بیشک قائل ہو سکتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے

اسلام میں

ایضاً

ایضاً (عقائد خداوندی و عمل خداوندی)

یہودیوں کے مان

۱۔ قربانی ایک فعل محمود اور پسندیدہ خدا ہے

۲۔ خدا کے ہاتھ پر ہیں اور بالکل مجسم انسان ہے

یہود

۳۔ آدمی ایک خاص قسم کے جانور کا گوشت کھانے سے ناپاک اور بد مذہب ہو جاتا ہے۔

۴۔ عبادت میں کوئی خاص حرکت نہ کرنے سے عبادت باطل نامقبول ہے۔
۵۔ غیر یہود سے سود لینا جائز ان کے مال کو خورد و برد کرنا اور ان کی عورتوں سے مباشرت کرنا جائز ہے۔

۶۔ صحف آسمان کا بغیر طہارت چھونا اور اس کا ترجمہ پڑھنا حرام ہے۔
۷۔ ساحرہ زانیہ اور مرتد کو سنگسار کرنا۔

۸۔ غلامی کا جواز دستخسان

۹۔ مذہبی اعتقاد کا یہود قوم سے مخصوص نہ ہونا

۱۰۔ طہارت۔ زکوٰۃ۔ روزے کی باریک عملی تدابیر و ذبیحہ میں مخصوص قواعد کی پیروی

۱۱۔ ختنہ۔

۱۲۔ طلاق کی آسانی

۱۳۔ توریت کے احکام منسوخ ہوئے ہیں

۱۴۔ احکام توریت کے علاوہ انہوں نے بہت سے امور کو ناجائز قرار دیا ہے۔

۱۵۔ شتا کی اشاعت بجائے توریت

۱۶۔ مذہب کو اسپرٹ سے کوئی واسطہ نہیں نفی پیروی ضروری ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ بعض شرعی اور دینی نصوص تاویل کر کے بجا لائیں اور جواز کی صورت نکال دی جائے۔

۱۷۔ یہود کی قوم کے علاوہ اشاعت مذہب ممنوع۔

دارالحرب میں اسلام کا بھجنا حرام

پچھلے دنوں مجھے ایک جید عالم سے خط و کتابت کا شرف ملا۔ بعض مسائل کے اختلاف پر میں نے ان کی رائے پوچھی اور اس سلسلے میں میں نے انھیں یاد دلایا کہ ہم مسلمانوں نے درحقیقت اس وقت اپنے کو متخذ و متدون اللہ اہل بابا کا پورا پورا مضداق کو لیا ہے اور ہمارے ساری خرابیوں کا راز اس ہی میں ہے۔ ان کا جواب سننے کے قابل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ حنبلیہ درحقیقت اہل حدیث ہیں اور مسند امام حنبل کی تدوین گاسو اسکے کوئی مقصد تھا کہ تمام احادیث کو یکجا کر کے ہر مسلمانوں کو عمل کی عورت دیکھائے

اسلام

ایضاً

ایضاً

ایضاً (دیکھو فتاویٰ مولوی احمد رضا خان بریلوی)

ایضاً

ایضاً

ایضاً (دیکھو کتاب تقویۃ الایمان)

ایضاً

ایضاً

ایضاً مع عقیقہ

ایضاً

ایضاً قرآن کے حکام منسوخ (دیکھو اتفاق سیوطی)

قرآن کے علاوہ علماء نے بہت سے امور کو ناجائز قرار دیا مثلاً موسیقی، فنون لطیفہ، سونا چاندی کا استعمال کرنا

اشاعت سنن بجائے قرآن

ایضاً

معلوم ہوئے۔ لیکن اسکے مجموعہ احکام و مجموعہ فقہ کا پتہ نہیں چلتا (غالباً مہدی آخر الزمان قرآن کو سمیٹ کر غار سامرا میں بیٹھ چکے تھے) امام شافعی نے کتاب الام میں اس فرقے کے ایک شخص کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”اس بارے میں کچھ لوگوں نے دو مذاہب اختیار کئے۔ ایک فرقہ حدیث کو نہیں مانتا اور خود قرآن اس کے نزدیک کافی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص نماز و زکوٰۃ اس حد تک ادا کر دے جس پر نماز و زکوٰۃ کا لفظ بولا جاسکتا ہے تو اسے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اسکے لئے کوئی دقت نہیں ہے اگرچہ وہ روزانہ صرف دو ہی رکعتیں پڑھا کرے اور جس معاملے میں قرآن کی کوئی ہدایت نہیں ہے وہ فرض نہیں ہے۔ دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ جس معاملے میں قرآن کا حکم موجود ہے اس میں حدیث قبول کر لی جائیگی، اس لئے جس معاملے میں قرآن کا حکم نہیں ہے اس کا قول بھی پہلے فرقے کے موافق ہے، اور نتیجہ بھی تقریباً دونوں کا ایک ہی ہے۔“ اس بنا پر اس فرقے کا بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے احکام کا مجموعہ مرتب کرے تاکہ اس پر بحث کیجائے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں اب تک صرف رد و قدح ہوتا رہا ہے۔ خود اس فرقہ نے اپنی ہستی کو بحیثیت ایک بانی فقہ جدید کے نمایاں نہیں کیا۔“ وغیرہ

یہ عالم دیوبندی نہیں بریلوی نہیں فرنگی محلی نہیں کہ انکی بات کو گزشتہ سمجھا جائے یا اس پر مضحکہ کیا جائے بلکہ علامہ شبلی کے شاگرد رشید اور محدث العلماء کے ”سراج المیرا“ مگر ذرا دیکھو تو کیسی خدا لگتی بات کہی ہے کہ فرقہ اہل قرآن کا مجموعہ احکام و فقہ کہاں ہے۔ سبحان اللہ! سپر بھی اگر کوئی یہ کہہ دے کہ مولانا آخر قرآن کیا چہیز ہے۔ تو بتائیے کہ وہ مردود ہوا یا نہیں۔

تو خیر مجھے آپ فرقہ اہل قرآن ہی سمجھ کر اصول اہل قرآن سن لیجئے۔

سب سے بڑا اصول اہل قرآن کا یہ ہے کہ قرآن سب سے زیادہ آسان کتاب ہے۔ نہ یہ مابعد البطیۃ کا فلسفہ ہے۔ نہ ریاضی کی کتاب کہ اسکے لئے تحقیق کیجائے۔ انسان جس کو خدا نے دو آنکھیں اور دو کان اور ایک صحیح دماغ دیا ہے۔ وہ قرآن کے سمجھنے کا اتنا ہی اہل ہے جتنا ایک علامہ اللہ ورعی قرآن کے سارے احکام پر ہمارا عمل ہونا چاہئے۔ نہ اس میں کسی تاویل کی ضرورت ہے اور نہ کسی تفسیر کی اور قرآن کا سب سے عظیم الشان ریفارم یہ تھا کہ خدائی مذہب کسی خاص فرقہ یا قوم کی جائداد نہیں ہے۔ عملی مذہب میں کسی خاص نسک (RITUALISM) کی خدا کو پروا نہیں اور نہ کسی برہمت کی اگرچہ اسکے اور تم کو یقین ہو کہ تمہاری نماز وہی ہے جو رسول اللہ نے ادا کی تو پڑھو اور ضرور پڑھو۔ لیکن اگر خدا کی عبادت کسی اور طریقہ سے کر سکتے ہو تو وہی قرآن کا منشا ہے عبادت کے لئے اوقات کی تعیین وہی کی گئی ہے جسوقت فطرتاً انسان کو اپنے معبود کی طرف متوجہ ہونا چاہئے یعنی قبل طلوع قبل غروب اور عشا۔ زکوٰۃ برابر اور متواتر دیتے رہو اور جتنی ہو سکے۔ رمضان کے روزے جس میں بہت سی مصلحتیں ہیں ایام معدودات یعنی ہائے ہم تک میں رکھو۔ اور نہ رکھو تو اسکی جگہ فدیہ دید و اپنے فوائد میں قرآن سے مشورہ لے سکتے ہو لیکن مجبور نہیں ہو۔ زمانہ اور ملک کا خیال رکھو۔ اصولاً اس چیز کو گناہ جانو جس سے تم کو یا کسی تمہاری ہم جنس کو جسمانی یا روحانی تکلیف پہونچے۔ اگر تم کو عربی نہیں آتی ہے تو قرآن کو اپنی زبان میں پڑھو۔ اور ہمیشہ یاد رکھو کہ شرک یا تقلید خواہ خفی ہو یا جلی وہ گناہ عظیم ہے اور ناقابل معافی ہے کیونکہ یہ چیز ملک و انسانیت کے درجے سے گرا دیتی ہے اور تمہارا لکے

غلام بجاتے ہو۔ حالانکہ تمھاری ماؤں نے تمکو آزاد جنا ہے۔ اور زیادہ صراحت چاہو تو ہمارے فلسفہ مذہب کو دیکھو یہ فرقہ کب پیدا ہوا اور کب تک دنیا میں رہا۔ تو اسکی تاریخ عجیب ہے۔

رمضان کی ۱۱ یا ۱۲ یا ۲۹ تاریخ سال ۶ کو پیدا ہوا۔ اور دو سو صدی تک جب تک عجم سے ایک بانہ اٹھی قائم رہا بعضو خیال ہے کہ یہ وہاں اس طرح آئی کہ ایک بزرگ محمد ہمدانی نام اس فرقہ کی اصل کتاب بغل میں دبا کر سامرہ کے ایک غار میں بیٹھ گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کتاب کی اکثر آیتیں گاؤں خود ہو گئی اور بعض نسخہ التلاوة ہیں اور جو باقی بچی ہیں وہ ایسی چسپستانی ہیں کہ ان کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں رہا اس فرقے کے ماننے والے چند بزرگ ہوئے ہیں جن میں سے زیادہ مشہور ابوالقاسم محمد بن عبد اللہ (روحی فداه) اور انکے اصحاب ہیں۔ مثل ابو بکر صدیق۔ عمر فاروق۔ عثمان فوسی النوری علی بن ابی طالب۔ لیکن خیال غالب یہ ہے کہ اس فرقہ کے لوگ اپنے کو ہمیشہ پوشیدہ رکھتے ہوئے پائے گئے۔ اور کبھی اپنے فرقہ کا اظہار نہیں کیا۔ اس واسطے کہ فریق ثانی ہمیشہ سیاسی قوت کے ساتھ غالب رہے۔ اگر ہمارے فرقہ کا کوئی آدمی ہمارے اصول کو اب بھی ذہن نشین کرے تو سب سے پہلے وہ یہ کرے گا کہ خواہ مخواہ اپنی قوم سے لام بندی یا مورچہ بندی نہ کرے گا اپنی قوم کی پسندیدہ باتوں کو اپنی کتاب کے معیار سے ملا کر قبول کرے گا۔ اور مکر وہ باتوں کو چھوڑ دے گا۔ مگر اس فرقہ کا بچہ اسکول میں اس وقت جائیگا جبکہ اس قوم کا دوسرا بچہ جاتا ہے گھر پر آکر وہ اپنے مان باپ کے ساتھ اپنے فرقہ کی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے باپ سے مذہبی عبادت کے طریقے یاد کرتا ہے۔ اس کے پاس اسکی یہ کتاب اس کی زبان میں ہوتی ہے جس کا وہ خود بھی مطالعہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اسکو خود اپنی زبان پر عبور ہو جائے

لیکن ہمارے فرقہ سے باہر کا آدمی تو خدا ہی اسکا حافظ ہے۔ اسکے نزدیک صغیر سنی کی شادی ایسی ہی چیز بھی اسکے مذہب میں جایز ہے اگر اس کی قوم میں ممانعت کیجاتی ہے تو وہ سب سے پہلے اس حکم کو توڑنے پر تیار ہوتا ہے اور پھر ساری وہ خرافات بائیں کرے گا جو انسانیت کے لئے باعث تنگ ہیں لیکن اس کے ساتھ اسکو مذہب کا ایسا غلو ہوگا کہ بقر عید میں ایک بکرے کی جگہ دو بکرے کی قربانی کرے گا۔ شام کے وقت اپنی جانناڑ سڑک پر بچھا کر نماز پڑھے گا بڑی عمدہ دائرہ رکھیگا۔ ادخا پانچامہ پھنے گا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کرے گا کہ اپنے سوا سب کو کافر اور بد دین جانے لگا جس نے اس سے آمین باجبر اور رفع یدین میں بھی اختلاف کیا۔

مولانا کے اس سوال کا جواب کہ فرقہ اہل قرآن نے احادیث کا انکار کن وجوہ سے کیا۔ اس کی سرگزشت نگار کی آئندہ اشاعت میں درج کروں گا۔

سید مقبول احمد بی اے

ماہیج کا جن شائع ہو گیا ہے، نمونہ طلب کرنے پر مفت روانہ کیا جاتا ہے۔ فیخر نگار

مراق

(فسانہ)

”اٹ اٹ! آہ آہ!!“

میرا معمول ہے کہ میں مغرب سے کچھ پہلے چہل قدمی کے لئے نکل جاتا ہوں۔ اور مغرب سے کچھ بعد واپس آ جاتا ہوں۔ کمپنی باغ کے گرد ایک چکر یا چاندنی چوک کا ایک گشت یا پارسی تھیٹر کیل کمپنی تک چہل قدمی، میری صحت جسمانی میرے دل و دماغ کے لئے جسدِ منفعت بخش ہے اسکا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ مجھے آج تک نہ امرت دہارا کی ضرورت پڑی نہ آتنگ نگرہ کوئیون کی! ہاں تو جیسا کہ میں نے کہا، مغرب سے کچھ دیر بعد واپس آ جاتا ہوں۔ اس کے بعد دوستوں کی آمد کے بعد دیکر شروع ہو جاتی ہے اور بارہ بجے تک مجلس احباب بڑے زور شور سے گرم رہتی ہے۔ غالباً مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ صدر مجلس یہ خاکسار ہی رہتا ہے!

”اٹ اٹ! آہ آہ!!“

اپنے کمرے میں قدم رکھتے ہی یہ آواز میرے کان میں آئی۔ ہمدردی کے تمام جذبات، بیمار داری کے تمام احساسات مجھ میں دفعتاً بیدار ہو گئے۔ میرا دماغ جلد جلد ان وسائل پر غور کرنے لگا۔ جو کسی کی تکلیف کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہو سکتے ہیں میری طبیعت میں فطرتاً یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ تکلیف کی ایک کراہ، کرب و اذیت کی ایک چیخ، درد کی ایک سسکی مجھے بیتاب و بیچین کر دیتی ہے اور میں بغیر ایک لمحہ توقف کے اپنا دست امداد دراز کر دیتا ہوں۔ انسان تو انسان جانور و نون تک کے لئے میری ہمدردیاں وقف ہیں حتیٰ کہ شب ماہ میں جو وقت کے چاند پر بانگ زنی کرتے ہیں تو میں اس قدرت کے لئے دست بردار ہو جاتا ہوں کہ چاند کو اسی وقت غروب کر دوں۔ ہر چند اس خیال نے ساتھ ہی چاند کے لئے بھی جی کڑھتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض حق پسند لوگ مجھے (Munim al-Harami) ”ہمدردی کا مجسمہ“ کے معزز نام سے پکارتے ہیں۔ اگرچہ میرا سمجھ حلقہ احباب کو تاہ نظری سے مجھے اس ”دلی ہونے والی“ ہستی سے مشابہت دینے کی ناکام کوشش کرتا ہوں جسکا ”شہر کا اندیشہ“ زبان زد خاص و عام ہے۔ بیوقوف کہیں کے

”اٹ اٹ! آہ آہ!!“

میں چھلانگ مار کر اندر پہنچا۔ میرے پلنگ پر میرا عزیز ترین دوست حامد پڑا ہوا، ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میں جلدی سے اس پر جھبک گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ”حامد کیا بات ہے“ اور اسی کے ساتھ اندازِ فخر و غرور کے ساتھ میسوی نظران بے شمار ادویات پر گئی جن کو میں نے نہایت سلیقہ سے ایک الماری میں چن رکھا تھا۔ یہ وہ مجرب و بیات

تھیں۔ جنگے اشتہارات روزانہ ہندوستان کے معزز اخبارات میں نکلتے رہتے ہیں اور جبکاتیر کبھی خطا نہیں کرتا۔ اور اگر بفرض محال کبھی ناکامی بھی ہو تو پھر پیر جی عامل کریم الدین کے تعویذ تو اس قسم کے مواقع کے لئے اکیسرا حکم رکھتے ہیں !!

”ات ان ہائے مرگیا، مار ڈالا“ حامدا بکی اور ذرا زور سے چلایا اور پہلے سے زیادہ جلد جلد کروٹیں، بدلتے لگا۔ ”آخر بات کیا ہے“ میں نے پوچھا مگر مٹا ایک خیال میرے ذہن میں آیا ”درا ٹھرو“ میں نے کہا ”میں خود معلوم کرونگا کہ کیا ہے میں آج تمہیں اپنی تشخیص کا قائل کر کے چھوڑنگا۔ فرسٹ ایڈ کا مطالعہ میں نے بیکار نہیں کیا ہے“ ”ہائے ہائے۔ سٹ گیا تباہ ہو گیا“

میں نے ہمدردانہ نظروں سے اسکی طرف دیکھا۔ ایک منٹ تامل کیا۔ میں آثار و علامت سے مرض کا دماغی تفحص کر رہا تھا۔ دفعۃً میری نظر اکلیم کے تازہ پرچے پر پڑی جو میسر پر پڑا ہوا تھا۔ آج ہی میں اسکا مطالعہ کیا تھا۔ میں نے اطمینان و خود اعتمادی کا سانس لیتے ہوئے کہا ”تمہیں درد گردہ کی شکایت ہے“

”ہائے نہیں“ اور پھر اس نے کر دٹ بدلی

”نہیں“ میں نے حیرت سے کہا ”مگر میں نے آج ہی اسکی بحث پڑھی ہے اچھا ذرا ٹھیرو۔ تمہارا شانہ پھٹ گیا ہے“ اور میں نے ذرا شکر داد طلب نظروں سے اسکی طرف دیکھا۔

”نہیں نہیں بخدا نہیں آہ!“ اس نے بری طرح سے آنکھیں بھیج کر اور منہ بگاڑ کر جواب دیا ”اچھا تو عارضۂ فتن کا دوا پڑا ہوگا“ میں نے یقین کلی کے ساتھ کہا ”اس صورت میں آلہ ایریکٹرس ایکٹنا۔۔۔“ ”نہیں اس نے کر دٹ بدلتے ہوئے کہا“ ”تو تمہیں قبض ہو گیا ہے“

نہیں یہ بھی نہیں ہائے“ مجھے اسکی انکار اور اپنی تشخیص پر غصہ آنے لگا تھا

”افوہ میں چوک گیا تھا میں نے تمہاری آنکھوں کو اب تک نہیں دیکھا۔ تمہیں یقیناً یرقان کا مرض لاحق ہے“ اور میں نے دل ہی دل میں اپنی تشخیص کی داد لی

”اوہ، اوہ نہیں نہیں“ کم بخت نے پھر انکار کر دیا

میراجی چاہ رہا تھا اپنے کو اور اسے دونوں کو کچا چبا جاؤں۔ خبیث کو دیکھو انکار کئے جا رہا ہے اور مجھے آج کیا ہو گیا ہے کہ کوئی تشخیص ٹھیک نہیں بیٹھتی

ہا! کیسی اچھی اچھی زود اثر مجرب دوائیں رکھی ہیں مگر یہ بد نصیب کسی سے گھبی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ مگر مجھے ایک ترکیب سوچنی میں حریفانہ انداز میں اگر کر بیٹھ گیا اور پوچھنا شروع کیا ”دہندہ ہے“

”نہیں“

”جالا“ ”نہیں، آہ“ ”خارش“ ”نہیں“

”بچھونے کا ٹاپہ“ اور میں اپنی اوپر تفرین کرنے لگا کہ اتنی ذرا سی بات اب تک نہ سمجھ سکا تھا
”نہیں“ اس نے پھر انکار کر دیا۔

”وار“ ”نہیں“

”خازیر“ ”نہیں“

”اورنگ زیب“ ”نہیں“

”کالا بخار“ ”نہیں“

”بال توڑ“ میں نے ڈپٹ کر اس طرح کہا۔ جیسے یہ نام مجھے یاد نہ آتا تھا در نہ میں شروع ہی سے سمجھ گیا تھا کہ مرض کیا ہے۔
لیکن جب اس پر بھی اس نے نفی میں جواب دیا تو میں سرد ہو گیا۔ اللہ اکبر انسان ضعیف انسان کا علم کس قدر محدود ہے۔ خدا کی
باتیں خدای جانے میں نے جھلا کر کہا ”آخر منہ سے تو پھوٹے کیا بات ہے؟“

وہ دفعتاً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دین اور آہ سرد بھر کر کہا ”مجھے محبت ہو گئی ہے، راشد مجھے
محبت ہو گئی ہے“

”آہ اتویہ بات تھی۔ یہ بات تھی جو بسا تر بار ہی تھی۔ میرا فرو شدہ جوش پھر پھر کر اپنے انتہائی نقطہ پر پہنچ گیا۔ محبت
کے نام نے میرے اعصاب کے ساتھ وہ کیا جو مفرح مرداریدی یا رفیق بدن (رجسٹرو) کی دس خوراکیں بھی نہ کرتیں۔ دنیا
میں یہ دوسرا موضوع ہے جس کے لئے میرا ذہن بیدار رہے۔ محبت آہ محبت۔ دنیا والوں نے اس پاکیزہ لفظ کے سمجھنے میں کس قدر
غلطی کی ہے۔ یہ لوگ پسندیدگی کا نام محبت، بوالہوسی کا نام محبت، خمار گندم کا نام محبت رکھتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ فلسفہ
محبت کے بلند معیار تک ان احمقوں کی کمزور نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ عشق صادق جس چیز کو کہتے ہیں انکو اسکی ہوا بھی نہیں
لگی۔ دوستی اور محبت کا فرق ان کے نزدیک بے معنی ہے۔ کوئی ان حماقت کے پتلون کو کس طرح سمجھائے کہ نادانوں، پہلے محبت
کے فلسفہ کو سمجھ لو پھر محبت کرو۔ میرا بدن افراط معلومات سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ ایسے ہی سانس میں اپنی معلومات
کا تمام سیلاب بہا دوں۔ ہاں آج میں اسے بتاؤں گا کہ میں فلسفہ محبت اور اسکے ہر جزو کا کس قدر ماہر خصوصی ہوں نفسیات
کو کس طرح یابی کی طرح سہل کر کے رکھ دے سکتا ہوں۔ عشق کے رموز و نکات کا کیسا بحر و خار میرے سینہ میں موجزن ہے
ہے۔ تحلیل نفسی میں کس قدر درخور حاصل ہے۔ جی! کوئی مذاق ہے۔ شہاب کی سرگزشت کو پندرہ مرتبہ پڑھ چکا ہوں“

”آہ! تیر نظر جگر کے پار ہو گیا“ حامد نے تڑپ کر کہا

”تیر نظر اگرچہ شاعرانہ مبالغہ ہے۔۔۔۔۔“ اور میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کہنا چاہئے حامد نے مجھے متاثر دیکھ کر آنکھیں

بھاڑ کر میری جانب دیکھا اور کہا ”تم تلقین دو غلط تو نہیں شروع کرو گے۔ مجھے یقین ہے!“

میں چونک پڑا فوہ! یہ بات تو میرے ذہن سے بالکل نکل ہی گئی تھی۔ میں اسکا دوست تھا اور میرا ہلا فرض تھا

کہ میں اپنے پند و نصائح سے اس کی کٹھن منزلوں سے اسے دور رکھنے کی کوشش کروں۔ استغفر اللہ کیا بھولا تھا میں نے اپنے چہرے کو سنجیدہ بنایا۔ ذرا سنبھل کر بیٹھا اور تین منٹ تک غور کرتا رہا کہ شرف کس طرح کروں۔ یکایک میں اچھل پڑا۔ پرانا مطالعہ میرے کام آیا اور میں نے حامد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر انتہائی ہمدردی کا جذبہ اپنی آنکھوں میں بیدار کر کے بڑی محبت سے کہا۔

لگایہ وگ جوانی میں کیوں میان جرات ابھی تو کھیل تماشے کے تھے تمہارے دن
اور پھر گویا مزید زور پیدا کرنے کے لئے آہ سرد بھر کر پرتنبیہ لہجہ میں کہا
”جسکو خدا خراب کرے وہ لگائے دل!“

حامد نے بھی فوراً موقعہ شناسی کے ساتھ بے پرواہی سے جواب دیا

یا تنگ نہ کرنا صح نادان مجھے اتنا یالا کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی
میراجی چاہا کہ اسکا منہ چوم لوں۔ کس قدر موقعہ شناس تھا۔ صرف ایک شعر سے میری ناصحانہ پوزیشن کو ختم کر کے اس
دوسری منزل پر لے آیا۔ جہاں نصیحت امداد و اعانت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ”میں اب وعظ و نصیحت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی
فلسفہ دانی کی شمع فروزان سے اسکو عشق صادق کے صحیح ڈگر پر ڈالوں گا“ میں نے سوچا ”آہ۔ جب سے دیکھا ہے تڑپ ہاہون
نواب و خور حرام ہے۔ دوست وصال یار کی کوئی تدبیر؟“

وصال یار! میرے بدن میں سناٹا آگیا۔ ہمدردی کے تمام جذبات یک نخت کا فور ہو گئے۔ دل سے بجائے محبت کے
حقارت کا ایک سیلاب یہ نکلا۔ ”وصال یار اور یہ مردود خبیث مجھ سے کتنا تھا کہ اسے محبت ہو گئی ہے۔ یہ ہے ان لوگوں کی
کائنات محبت۔ محبت کا ادعا اور تنائے وصال۔ ناممکن، ناممکن یہ دونوں باتیں دوش بدوش نہیں چل سکتیں۔ محبت
کا لطف تو فراق و ہجر ہی میں ہے۔ ایک نفع محبت کرنے بعد دیکھنے کی آرزو ہی دل میں پیدا ہونی چاہئے یہ محبت کی تو میں ہے
کہ محبوب کو قطعاً فراموش کر نیکی کوشش کی جائے تاہم ترک ترک کا درجہ حاصل کرے!!“

”اگر دیدار بازی کا موقعہ نصیب نہ تو زندگی مشکل ہے“ اس نے پھر کہا

میرے سینہ میں شعلے بھڑکنے لگے۔ میرا وہ پاکبازانہ لکچر جو میں سوچے بیٹھا تھا۔ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گیا۔
”اور اگر بوس و کنار کا موقعہ بھی ملے تو فوراً علی نور“ وہ پھر بولا۔

میں نے اپنی شعلہ فشان آنکھوں سے اسکی طرف گھور کر دیکھا۔ میں اپنی جگہ گسسا گسسا کر رہ جاتا تھا و فور غضب قوت
گویائی سلب ہو گئی تھی۔ کس قدر بیہودہ بکواس تھی۔ محبت سے کوسوں دور پاکیزگی کا میلون پتہ نہیں اف سے ملو تو ہوتا!
”دیکھیں ان کے پھول کے رخساروں کو چو منا کب نصیب ہوتا ہے“

استغفر اللہ! میرا بدن تھر تھرتھار کانٹے لگا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں ڈنڈے کے زور سے اسے صحیح راہ محبت بتانے کی خواہش

اپنے دل میں پار ہاتھا۔

”آہ یہ روز بھر ختم ہوا اور شب وصال اپنے اردے زیادہ کھائے“

معاذ اللہ! میں نے اپنی جیب میں چاقو کھول لیا میرے سر پر خون سوار ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور کچھ بعید نہ تھا کہ وہ چلتی ہوئی چیز جیب سے باہر بھی آجاتی۔ مگر یکایک باہر آہٹ ہوئی اور سعید، منیر، واجد اور ضیا داخل ہوئے۔

ہماری پارٹی مکمل تھی۔ مجھے قدرے سکون و مسرت حاصل ہوئی کہ اب مجھے داد ملیگی اور حادثہ کو خوب آرٹسے ہاتھوں لوں گا۔ میں نے فوراً اپنے برائیکھتہ حیات کو فرو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، قبل اسکے وہ لوگ کرسیوں پر اچھی طرح بیٹھ چکین کہنا شروع کیا ”یہ ناپاک ہستی جو اس وقت پلنگ پر دراز ہے۔۔۔“

”کیا بات ہے“ واحد نے اپنی عینک میں سے جھانکتے ہوئے برا قطع کلام کیا

”منیر بولا“ آپ کی گفتگو کی تمہید چونکہ نہایت نامعقول طریق پر شروع ہوئی اس لئے۔۔۔“

”واہی ہو“ میں نے کہا ”بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔“

سعید نے شرارت سے کہا ”پہلے اپنے الفاظ کو واپس لیجئے اور تحریری معافی مانگیئے“

ضیا سب سے چھوٹا مگر سب سے کھوٹا تھا، بندر کی طرح آنکھیں ملا کر بولا ”اور پھر ایسا یاد رکھئے تاکہ آج کا یاد کیا برسوں نہ بھولے!! اس نے آنکھ سے دواؤں کی الماری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
اس پر سب مسکرا دیئے۔

میں نے پٹیان کس لین اور اپنے قد کے پانچ فٹ چھ انچ کی پوری لمبائی لئے ہوئے تن کر کھڑا ہو گیا ”عراق د لگی برٹ
میں آپ لوگوں تک خبر پہنچانا چاہتا ہوں کہ جناب کو خود ان کے قول کے مطابق مرض محبت لاحق ہو گیا ہے“
حیرت کی ایک بے معنی آواز سب کے منہ سے نکلی اور سب کی آنکھیں حادثہ کے چہرہ پر گڑ گئیں۔
”مرحبا!“ سعید نے اپنی عینک ریشمین رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا ”آفرین“

عمر رست کہ آوازہ منصور کہن شد من از سر نو جلوہ وہم وار در سن را
منصور اور دار در سن کا نام سکر میری باچھین کھل گئیں۔ احمد اللہ کہ سعید محبت کی منزل اعلیٰ میں یقیناً میرا ہم زبان
ہو گا۔ ورنہ اگر اسکی بھی ذہنیت اس قدر پست ہوتی تو اتنا اعلیٰ شعر نہ پڑھتا۔

منیر نے ہنس کر کہا ”دور مجنون گذشت و نوبت ماست“

میوے سینے میں و فور مسرت سے آماس پیدا ہونے لگا۔

واحد نے کہا ”عاشقی شیوہ رندان بلاکش باشد“

”بلاکش! عمرت دراز باد تم سب میرے ہم خیال ہو“ میں نے سوچا اور خوشی سے میری سانس پھولنے لگی۔

ضیاء نے کرسی کی پشت کو اپنی دونوں بغلون میں لیتے ہوئے اپنی بائیں آواز میں کہا۔ ”عاشقی کھیل نہیں جسے بڑے کھیلین
اس کجخت کے مزاج میں سے کبھی بچپن نہیں جائیگا۔“ میں نے سوچا۔ میں نے ایک عمر رسیدہ ماسٹر کی طرح تبسم کیا۔ وہ تبسم
جو صرف اس وقت نمودار ہوتا ہے جب لڑکے سبق اچھی طرح یاد کر لیتے ہیں۔ پھر ایک کمانڈر انچیف کی طرح ان سب کا نظری
جائزہ لیتے ہوئے کہا ”اور آپ کو بہ این ادعائے محبت تمنائے وصال بھی ہے!!“

سب حیرت زدہ ہو کر میری جانب ان نظروں سے دیکھنے لگے جیسے کوئی پاگل کو دیکھتا ہے۔ میں بھوچکا سا ہو کر رہ گیا
مجھے کامل توقع تھی کہ میری زبان سے یہ فقرہ سنتے ہی سب گگ حد پر ایک تھقہ لگائیں گے۔ اور ابھی دم کے دم میں لعنت کے
ووت پاس ہو جائیں گے۔ آخر چند لمحے کی تکلیف وہ خاموشی کے بعد واحد نے چھڑی سے زمین کر دیتے ہوئے کہا ”افسوس
ہے ہم آپ کا مدعا سمجھنے سے قاصر رہے۔“

میں نے کھانے پینے سے کہا ”یہ۔ یہ۔ من خوب می شناسم۔ جی ہاں مدعا سمجھنے سے قاصر رہے۔“
”نہیں واقعی“ منیر نے تائید کی۔

”تم لوگ فضول باتیں مت کرو“ میں نے کہا اور خفت چھپانے کے لئے پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

سعید نے کہا ”جناب محترم نے جو اپنی زبان فیض تر جان سے یہ فقرہ اس تیور کے ساتھ ادا فرمایا جیسے کوئی استحالہ
عقلی یا عادی کا تذکرہ۔۔۔“

میں نے جھنجھلا کر کہا ”خاموش رہو۔ میں ان بڑے بڑے لفظوں سے مرعوب ہونے والا نہیں ہوں ابھی کام مجھ پر
سنانے رکھ کر گفتگو شروع کر دی تو ساری لغت دانی دہری رہ جائیگی۔“

سعید نے پھر کہا ”آخر جناب کس استدلال کی بنا پر محبت سے تمنائے وصال کو منقک کر سکتے ہیں“
میں نے کہا واللہ تم سب لوگ گوکھے ہو۔ محبت کی تعریف سے اصلاً واقف نہیں۔“

سعید نے اپنے چہرہ پر شاگردانہ جھلک پیدا کر کے کہا ”تو ہمیں کامل امید ہے کہ جناب ہمارے تاریک دماغوں کو
اس خاص روشنی سے منور فرمائیں گے۔“ اسکی اس سنجیدگی پر مجھے غصہ آنے لگا۔ کم نخت ہزار مرتبہ اس موضوع پر میرے خیالات
سن چکے تھے مگر کیسے انجان بن رہے تھے

ضیاء ”مگر پہلے تمنائے وصال کی تشریح تو ہو جانا چاہئے وصال کی کون سی صورت؟“

سعید ”ہر ممکن صورت۔ ذرائع کو اتنی اہمیت نہ دینی چاہئے۔“

میرا خون کھولنے لگا۔ میں اپنی پہلی غیر متوقع شکست کی وجہ سے دفعتاً کچھ تھک گیا تھا۔ لیکن یہ الفاظ سن کر میری
طاقت عود کر آئی افوہ! یہ مردود اپنی بوالہوسی اور بد معاشی میں یہاں تک ترقی کر گئے ہیں۔ بڑے فلسفی بنتے ہیں اور محبت
کے حلق اس قدر رکیک خیالات رکھتے ہیں میں نے پھر کر کہا ”مالا نفور۔ تم مین حیوانی روح حلوں کر گئی ہے۔ تم لوگ شیطان کی

ذریات میں سے ہو۔ انسانی خصائص جو ملکوتی خصائص پر چشمک نہ کرتے ہیں تم میں سے اسی طرح مفقود ہو گئے ہیں جس طرح بال عمر بھرنے لگنے کے جوہر سے بال!۔ بد معاش لوگو! تم مجھ سے جیسی پاکیزہ چیز کو بھی اپنی بد باطنی اور سیاہ قلبی کی وجہ سے پان بہار سمجھتے ہو جو تھوڑی دیر کی لذت دہن کے لئے پان کے ساتھ کھاٹی جاتی ہے۔ محبت محبوب کو اس قدر پر عظمت اس قدر پر احترام چیز بنا دیتی ہے کہ حصول اس کا خیال بھی بدن میں کیلپی پیدا کر دیتا ہے۔ نادانوں! تمہارے دل زنگ آلود ہو گئے ہیں برا سو کی وہ شہابی بھی اس زنگ کو نہیں چھڑا سکتی“ میں نے الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی تقریر کو ختم کیا

سعید نے نہایت سنجیدگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”خواجہ حسن نظامی کا قرآنی آسان قاعدہ کتنے میں آتا ہے؟“

یہ تھا وہ جواب جو اس نے میری طرف اتنی برجوش تقریر کا دیا۔ سب نے ملکر ایک بلند قہقہہ لگایا۔ حامد بھی اب تڑپنا چھوڑ چکا تھا اور شریک تماشا تھا۔ میرے دل میں ایک بے نام سی بچپنی کا احساس پیدا ہونے لگا تھا۔ چھپڑ چھپڑ روزانہ ہوتی ہے۔ لیکن آج تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب میرے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہیں۔ کہیں انھوں نے سازش تو نہیں کر رکھی ہے ”ادھر“ میں نے سوچا ”اگر ایسا ہے بھی تو مجھے کیا پرواہ ہے۔ میں اکیلا ان سب پر بھاری ہوں“ میں نے غضبناک ہو کر کہا ”جناب، اب ہالنے سے کام نہیں چلے گا۔ سیدھے جواب دیجئے!“

”تم تو مجھے کچھ بیوقوف سے نظر آتے ہو“ واحد بولا ”ارے بھئی عورت مرد کی محبت کا منشاء حقیقی دونوں کی یکجائی اور اتصال باہمی ہونا چاہئے۔ محبت کو آخر تم نے اس قدر مہیب اور ڈراؤنی چیز کیوں بنا دیا کہ جس کا قدم در میان میں آتے ہی محبوب ایک خوش رنگ مگر زہریلا سانپ ہو جائے۔ اگر محبت ایسی ہی چیز ہے تو پھر پیچھے سے کیوں نہ کیجائے۔ تاکہ پھر یہ ہجر و فراق، دوری و وصل، انکار و پذیرائی کا کھڑا گ ہی ختم ہو۔ تم تو بالکل منشی سجاد حسین کی ایک تصنیف ہو“ مطلب یہ تھا کہ احمق الذین ہو!۔ رہ تو سہی میں تیری کیسی خبر لیتا ہوں میں کوئی غضبناک جواب دینے ہی والا تھا

کنج میں ضیاء بول اٹھا ”اچھا یہ تو بتائیے آپ شادی بر بنائے محبت کے قائل ہیں یا اندھا دہند شادی کے“ میں نے کہا شادی بر بنائے محبت؟ اس سے زیادہ ناکام شادی کوئی نہیں ہو سکتی! شادی محبت کی موت ہے۔ جو شخص محبت کی وجہ سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ گویا ایک تشنہ کام ہے جو گلاس کی اس لئے تلاش کرتا ہے کہ پانی پی سکے۔ اسکے برخلاف دیسی شادی گویا گلاس کا خریدنا ہے گلاس کی خاطر“ اور میں نے اکثر فخر کے تیوروں سے چاروں طرف نظر ڈالی۔

سعید (مسکرا کر) جی، جس کتاب سے آپ یہ فقرے نقل کر رہے ہیں کبھی اسکو سمجھ کر بھی آپ نے پڑا ہے؟

ضیاء۔ ”تم واللہ بڑے کف ابا بیل ہو“

اس پر سب نے فرماشی قہقہہ لگایا اور میں اس غصہ کے گونکا ہو کر رہ گیا۔ مگر میری آنکھیں شعلہ فشانہ کر رہی تھیں

واحد نے مسکرا کر کہا ”خیر یہ باتیں تو سب ہوتی ہی رہیں گی۔ یہ تو بتائیے کہ آپ نے حامد کے مرض کا کیا علاج تجویز کیا“

ضیاء۔ ”وہ یہ کونسا مشکل بات ہے۔ دعا، عقدا، محبت۔ سید ہاساد! علاج ہے“

”چپ رہو“ مین نے غصہ سے کہا

”صنیا“ اچھا تو مطلوب طالب کے قدموں پر سہی، یہ نہیں تو محبت کے مایوس مریضو! پھر ثہاب کی سرگزشت ہے!
”بالکل خاموش ہو جاؤ“ مین نے دانت کٹکٹا کر کہا
”آپکو خدا کی قسم مجھے شروع سے آخر تک پڑھو کے متعلق کیا خیال ہے
واحد نے بطور تجویز کے کہا۔

عنان ضبط میرے ہاتھ سے چھوٹی جا رہی تھی۔

مین ”نہیں بھئی اشد شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو“ قہقہہ پڑا۔

سعید نے سنجیدگی سے کہا یہ سب کچھ نہیں اسکا صرف ایک علاج ہے ”سب ہمہ تن اشتیاق ہو کر سکی طرف دیکھنے لگے
کم بخت نے کچھ ایسی سنجیدگی سے کہا کہ خود میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوا کہ دیکھیں کیا کہتا ہے
”اسکا علاج“ اسنے کہا ”بہترین علاج صرف ایک ہے اور وہ اسنے گلا صاف کیا، یہ کہ پندرہ دن میں بال جڑ
سے کالا!“

اسپر ایک فلک شکاف قہقہہ پڑا۔ مین اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ غصہ سے میرا بدن کانپ رہا تھا۔ ”بکومت“ مین نے
چیخ کر کہا ”بکومت“ مین گرج اٹھا ”بکومت“ مین نے دیو کی طرح جنگھاڑ کر کہا دفعۃً باہر زینہ پر کسی کے جلد جلد اترنے
کی آواز آئی اور دوسرے لمحہ والد بزرگوار حیران و ششدر کمرہ میں داخل ہوئے سب کھڑے ہو گئے۔ یہ آہستہ آہستہ
کرسی پر آکر بیٹھ گئے اور اوہرا دہر دیکھ کر پوچھا ”یہ کون جنگلیوں کی طرح چیخ رہا تھا؟“ سب کی نظریں بیباختہ میری طرف
اٹھ گئیں۔

”یہ راشد ہو گا۔ مین پہلے ہی سمجھا تھا اور اس خبطی کے سوائے کون ہو سکتا ہے“ ان کے چہرہ پر تبسم کے آثار نمایاں ہوئے
اور میرے دوستوں کی طرف مخاطب ہو کر انھوں نے پوچھا کیا بات تھی۔ محبت کے متعلق گفتگو تھی یا اشتہاری دواؤں کے
سب کے سب نظریں جھکا کر مسکرانے لگے۔ میرے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ مین نے اپنے دوستوں کی نظریں جو محبت
پیدا کر رکھی تھی وہ آج والد بزرگوار فنا کئے دے رہے تھے۔

”خدا جانے اسے کیا خبط ہو گیا ہے“ وہ پھر بولے ”گھر میں بھی ہر وقت اسی قسم کی باتوں پر دبا دبا کر رہتا ہے! اس کے
چھیڑنے پر اور سب اسے چھیڑتے ہیں“ پھر میری طرف دیکھ کر کہا ”شرم نہیں آتی۔ بی۔ اے تک کی پڑھائی۔ کاندو کے تانے
مین بہائی۔ تمہیں اشتہاری دواؤں سے فرصت ملے تو کوئی اور کام کرو۔

سعید جناب قبائے ہمارا بھی انھوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اسی لئے ہم آج ارادہ کر کے آئے تھے کہ آج انھیں
خوب بنائیں گے اور انکی یہ عادت ہمیشہ کے لئے چھڑا کر رہینگے۔ ہم نے حامد کو پہلے ہی پٹی پڑھا کر بھیجا تھا۔ وہ تو آپ تشریف

لے آئے ورنہ ہم آج ان سے عہد لیکر چھوڑتے۔“

”جھوٹا نامراد۔ ارادہ کر کے آنے تھے۔ سب جھوٹ حامد یقیناً عاشق ہو کر آیا تھا، سعید نے اس ڈر سے کہ کہیں والد نے سب کچھ نہ سنا ہو اور حامد کے باپ سے کہہ دیں یہ اور مجھے بنانا! والد نہوتے تو بتاتا کہ تم مجھے کس طرح بناتے ہو۔“

”ابا ناشدنی۔ سب ہی تو تجھ سے تنگ ہیں۔ پھر کہنے لگے ”عزیزم سلمہ! ہم تو تمہارے بھلے کے لئے کہتے ہیں۔ آگے تم جانو خود ہی خوار ہو گے۔“

سلمہ۔ ہونہ۔ مار تو ڈالا اور سلمہ۔ تمام دوستوں کے سامنے ذلیل کیا۔ سخت تحقیر ہوئی۔ منہ دکھاتے شرم آئیگی۔ سلمہ۔ ہونہ۔ غرض قصہ مختصر یہ کہ اس دن والد نے بڑے تحقیر کی۔ مین بیوقوف تھا۔ جو ان عاقلانہ مسائل کا تذکرہ ان نادانوں سے کیا کرتا تھا۔ اس دن کے بعد سے مین نے مطلقاً ان لوگوں کے سامنے ان عمیق مسائل کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ نادان ہیں۔ کم فہم ہیں۔ نہ یہ محبت کو جانیں نہ جینتان کو۔“

یہ ہے وہ قصہ جو موسم گرما کی ایک گرم دوپہر مین راشد نے مجھے سنایا۔ اپنے حلقہ تعارف میں وہ منجھوٹا جو اس مشہور ہے بعض جنون اور مایہ خویا کا مرض بتاتے ہیں۔ مین نے ذاتی طور پر اس کے متعلق کبھی کچھ نہیں سوچا۔ لیکن اگر چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ اسکی دماغی حالت اس نقطہ پر ہے جہاں دیوانگی اور فرزانگی کے ڈانڈے ملتے ہیں پھر کیا اسکی دیوانگی کوئی عجیب یا کمیاب دیوانگی ہے۔ اثنائیں کہتے ہیں جو اصلیت کے ادراک میں کچھ نہ کچھ اس طرح نہیں بھک جاتے؟ کتنے ہیں جو حقیقت کا پتہ لگا سکتے ہیں؟ ہم سب کم و بیش راشد ہی کی طرح چند در چند گمراہیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم مین رازداری اور ضبط کی قوت اس سے زیادہ ہے۔ فرسٹ ایڈ کو اس کے لئے میٹر یا میڈ لکا کی قائم مقام ہو۔ لیکن غالباً وہ محبت اور جینتان کو ہم میں سے اکثر سے بہتر جانتا ہے!

رفیعی اجمیری

سریاق حشیم

اس کے متعلق حضرت نیاز فتح پوری صاحب ڈیڑھ سالہ نگار تحریر فرماتے ہیں کہ تجربہ سے یہ سرمہ بہت مفید ثابت ہوا ہے اور آنکھ کے بہت سے امراض کیلئے کارآمد چیز ہے۔ قیمت علاوہ محصول (پہر) انڈین میڈیکل سٹور نظیر آباد لکھنؤ

مومن و کلام مومن

(یہ سلسلہ ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء)

خصوصیات غزل | لغت میں غزل کے معنی ہیں ”حدیث زنا“، ان کے ساتھ عشقبازی کرنا اور اس عشقبازی میں خطرے کی پروا نہ کرنا

صاحب معجم کی رائے ہے کہ ”غزل کو مناسب اور خوشگوار وزن شیریں اور سلیس الفاظ، دلنشین معانی سے آراستہ ہونا چاہئے، درشت کلمات اور ناگوار ترکیب سے بچنا غزل گو کا اولین فرض ہے

سعدی اور حافظ، جامی اور خسرو غزل کہنے والوں کے سر تاج اسی لئے ہیں کہ ان لوگوں نے غزل کی زبان الگ کر لی ہے۔ اُردو میں غزل گوئی کے میدان میں میر سب سے آگے اس وجہ سے ہیں کہ غزل کے لئے انھوں نے الگ اقلیم بنا لیا ہے لیکن اس کے ساتھ میر ”جذبات تغزل“ کے نشہ میں اس قدر متوالتے ہیں کہ ان کو ”انفاظ“ اور دوسرے آوروں کے اہتمام کی طرف چندان توجہ نہیں ہوئی، مومن نے جذبات کے ساتھ قیود اور پابندی کے آرد میں آمذکار رنگ پیدا کر کے دنیا کے سامنے ایک نئی چیز پیش کی ہے۔

معنوی حیثیت سے دیکھئے کہ غزل کی بنیاد حسن و عشق ہے، حسن عشق پیدا کرتا ہے، عشق سے حسرت یل اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ عشق، عاشق کو دلیر اور جانباز بنا دیتا ہے، اس کو جان ایسی چیز کی مطلق پروا نہیں ہوتی۔ فارس کا ایک شاعر کہتا ہے:

تا سرند ہم پانہ کشم از سر کویش
نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

”مومن“ اس مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے:۔

کشتہ ناز جان روز ازل سے ہوں مجھے
جان کھونے کے لئے اللہ نے پیدا کیا

۲۔ عشق میں مشوق پرستی کے علاوہ عاشق کا کوئی مشغلہ نہیں ہوتا، عشق ہی عاشق کا ایمان ہے عشق ہی عاشق کا مذہب ہے۔ فارس کا شاعر اس مضمون کو یوں ظاہر کرتا ہے:۔

دو عالم را بہ یک بار از دل تنگ
برون کردیم تا جائے تو باشد

”مومن“ نے اس مضمون کو ایسے انوکھے انداز میں بیان کیا ہے کہ شعر موتی بن گیا ہے:۔

چارہ گر جنت میں اس کے آستانے لگے
ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سرٹیکا کیا

”جنت“ راحت و آرام کی مراد ہے اس کا حصول طلب خدا کا ثمرہ ہے، ”مومن“ اپنے عشق میں یک در گیر

و محکم گیر، گو کس طرح ثابت کرتے ہوئے آستان یار کو جنت پر ترجیح دیتے ہیں۔

۳۔ عاشق، عشق کی مصیبتوں سے چھوٹنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ان کو عشق کا شعار جانتا ہے۔ فارسی شاعر کہتا ہے
نالہ از بہر رہائی نکلند مرغ اسیر خور و افسوس زمانے کہ گرفتار بنود

”مومن“ اس مضمون کو اس طرز میں ادا کرتے ہیں:

اب قید سے امید رہائی نہیں رہی ہمدرد پاسبان ہیں جو زندانیوں میں ہم
عام موازنہ اور مقابلہ کے بعد ”مومن“ کو جذبات تغزل میں ”حافظ“ کے سامنے لا کر دیکھئے، حافظ کا پایہ تغزل میں
ایسا ہے کہ استادان فن حافظ کی غزل گوئی کو کرامات کہتے ہیں۔

موازنہ حافظ و مومن (حافظ) جہان زابروے عید از ہلال و سمہ کشید

ہلال عید برابر وے یار یا دید دید

(مومن) نیم بسل ہیں نہ چھیڑاے تپش دل کہ ابھی روئے قاتل کا نظارہ کوئی دم کرتے ہیں
حافظ صاحب کہتے ہیں کہ ہلال عید کے جو لوگ منتظر ہیں ان کو ابروے دوست دیکھنا چاہے وہی سب کچھ ہے۔
”مومن“ ایسے عاشق بیتاب و از خود رفتہ کو عید اور محرم کی کیا خبر وہ نظارہ یار کے وقت بخودی سے دل کا اضطراب
بھی پسند نہیں کرتا کیونکہ اس یکسوئی نظارہ میں فرق آ جائے۔

انصاف شرط ہے دیکھئے دونوں شاعروں میں جذبات عشق و محبت کس نے بہتر صورت میں ادا کئے ہیں

(حافظ) دانی کہ چہیست دولت دیدار یار دیدن در کوئے اگدائی بر خسروی خریدن

(مومن) گلی میں اس کے نہ پھر آتے ہم تو کیا کرتے طبیعت اپنی نہ جنت کے درمیان لگی

حافظ کہتے ہیں کہ معشوق کے کوچے کی گدائی بادشاہی سے بہتر ہے

”مومن“ کا عشق جنت پر کوئے یار کو اس طرح ترجیح دیتا ہے کہ مجال دم زون باقی نہیں رہی

(حافظ) شراب لعل کش و روے مہ جبینان بین خلاف مذہب آنان جمال اینان بین

(مومن) مے نہ اتری گلے سے جو اس بن مجھ کو یاروں نے پارسا جانا

”حافظ“ صاحب شراب پیئے اور نظارہ یار کرنے کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام پسند نہیں کرتے

”مومن“ کے حلق کے نیچے شراب زہر کی طرح بھی سہج میں اتر نہیں سکتی

”حافظ“ کے یہاں پیشتر خوشحالی اور زندانہ نازع البالی صورت دکھائی ہے۔

”مومن“ عاشق تن کے یہاں اس کا ذکر کمان جذبات تغزل و عشق میں دونوں کا فرق ظاہر ہے

”حافظ“ سب موازنے کا منشا یہ تھا کہ ”مومن“ نے جذبات تغزل کا جو مفہوم سمجھا ہے وہ جذبات عشق کے عین بقا ہے

عاشق کو جیسا ہونا چاہئے، مومن اپنے اشعار غزل میں نمایاں ہے۔
ناقدان فن اور صاحبان مذاق نے غزل یا عشق کے جذبات کو ذیل کی صورتوں میں نمایاں کیا ہے۔
(معشوق کا انداز کج ادائی)

جذبات تغزل

فارسی شاعر کہتا ہے:

باغیر نشینی و فرستی ز پئے ما آن را کہ نداندرہ کا شانہ مارا

”مومن“ کی شان دیکھئے:

مجلس میں تانہ دیکھ سکون یار کی طرف دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف
فارسی شعر میں معشوق اپنے محفل میں بلانے اور غیر کے ساتھ ملاطفت دکھانے اور عاشق کے جلانے کے لئے اس کو ایسے
شخص کی معرفت بلواتا ہے جو عاشق کا گھر تک نہیں جانتا۔

”مومن“ کا رنگ دیکھئے کہ وہ مجلس میں موجود ہے، رقیب کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھتا ہے، اس پر اکتفا نہیں بلکہ عاشق
کے جلانے کو معشوق عجیب لطیف انداز کج ادائی دکھاتا ہے۔

ارباب فن دونوں کا فرق محسوس کریں اور ”مومن“ کے جذبات کی داد دیں،

(معشوق کا ذکر کسی عنوان سے ہو بہتر ہے)

فارسی شاعر کا خیال دیکھئے:

بہر مجلس کہ جا سازم حدیث نیکو ان پرسم کہ حرف آن مہ نامہربان را در میان پرسم

”مومن“ کا انداز دیکھئے:

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا کہ ہر ہر بات پر ناصح تمھارا نام لیتا تھا
پہلے شعر میں ذکر معشوق معمولی رنگ میں ہے، خود عاشق ذکر کرتا ہے اگرچہ اس کے لئے پیرایہ تلاش کرتا ہے۔
”مومن“ نے دشمن عقل ”ناصر“ کی نصیحت میں عشق کے مزے لئے ہیں، اس مضمون کو مومن نے کہاں سے کہاں پڑا دیا
عربی کا ایک شعر بالکل اسی مضمون کا ہے:

احب العدو و لتکر الہا حدیث الجیب علی مسمعی

نصیحت کرنے والے کی نصیحت اس نے پسند کرتا ہوں کہ بار بار دوست کا نام سننے میں آتا ہے

”مومن“ کی بلند خیالی نے اور لطیف انداز بیان نے دونوں شاعر دن کو پست کر دیا

(ستم محبوب)

فارسی شعر: این جو رد گیر ست کہ آزار ما شقان چندان نمی کند کہ بہ بیدار بخو کند۔

مومن : ہے

جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو یوفا پھر حاصل پیدا کیا
مضمون قریب قریب دونوں ایک ہیں مگر ”مومن“ نے اپنے شعر میں اثر کی بجلی بھر دی ہے، الفاظ اور بندش سے
آسمان شاعری میں ستارے جڑ دے ہیں
(محبوب کی نسبت بدگمانی)

فارسی شاعر کہتا ہے : ہے

کاش اے محرم نمی پرسیدیم کان مہ کجاست یک سخن گفتی و باز از صد گمانم سوختی

مومن : ہے

روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دیگا ان کو شوقِ آرائش دل ہے بدگمان پنا
(معشوق کو خط لکھنا)

فارسی شاعر کہتا ہے : ہے

بہ جانان نامہ ہرگز عاشق بیمار نہ نویسید کہ از بے طاقتی یک حرف را صد بار بنویسد

مومن : ہے

حالِ دل یار کو لکھو نہ کیونکر ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
(کسٹم کی ادا)

فارسی شاعر کہتا ہے : ہے

تا مرا در نظر مدعیانِ خوار کند ہر چہ گویم بخلافِ سخنم کار کند

مومن : ہے

لاش کس کی ہے؟ یہ عدو سے نہ پوچھ میں ہوں گشتہ ترے تغافل کا
فارسی شعر میں ابتداء ادا ہے اور مومن کے شعر میں انتہا ہے، لطف بیان نے شعر کو اپنا کر لیا ہے۔
تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تو ضخیم دفتر ہو جائے، یہاں یہ دکھانا منظور ہے کہ ”مومن“ نے تغزل کا جو مفہوم
سمجھا ہے اور دوسروں کو سمجھانا چاہا ہے وہ اپنی جگہ پر بے مثل ہے، مومن سے پہلے فارسی شاعری اردو کے سامنے جو کچھ
ناز کرتی بجاتھا لیکن ”مومن“ نے اپنے کمال شاعری سے اردو شاعری بالخصوص غزل گوئی کو اس مرتبہ پر پہنچا دیا
ہے کہ اس کا جواب مشکل سے کسی زبان میں مل سکتا ہے

”مومن“ کا یہ کمال دیکھئے کہ غزل، مثنوی، قصیدہ، واد سوخت کی زبان، ترتیب و الفاظ بمعانی۔

انداز بیان - لہجہ وغیرہ میں نمایان فرق رکھتا ہے۔

الفاظ غزل | غزلوں میں مومن نے جس طرح الفاظ کا اہتمام کیا ہے اس کی چند مثالیں دیکھ لیجئے:-
یہ جوش یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا ”سا“
اس شعر میں لفظ ”سا“ جس اہتمام سے رکھا گیا ہے اس نے لطف معانی کو دو بالا کر دیا ہے۔
یہی ”سا“ تمام غزل میں علیحدہ علیحدہ رنگ دکھاتا ہے۔ دوسری غزل میں دیکھئے:-
اس کو سچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا
ایسی لذت خلش دل میں کہاں ہوتی ہے رہ گیا سینہ میں اس کا کوئی پیکان ہوگا
اس شعر میں لفظ ”کوئی“ کی تنکیر نے ایسی خوبی اور دلکشی پیدا کر دی ہے جس نے تمام شعر بالخصوص پہلے مصرعہ کو سچے
میں ڈال دیا ہے۔

درد ہے جان کے عوض ہر رگ پے میں ساری چارہ گر! ہم نہیں ہونے کے جو دوران ہوگا
اس شعر میں ”نہیں ہونے کے“ الفاظ نے محاورہ کی بسیاختگی کے ساتھ اظہار جذبات میں جادو کیا ہے۔
سینے سے گھبرا کے آخر جان لب تک لگئی حال پہونچا یاں تلک اور تم نہ آئے یاں تلک
اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں یاں تلک دو جگہ کس طرح آیا ہے اور دونوں جگہ کیا کام کر رہا ہے ارباب فن سے پوشیدہ نہیں
کیا دل کو لے گیا کوئی بیگا نہ آشنا کیون اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم
اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں ”سے“ کتنا فصیح ہے؟
اسے خوڑ گئی ہے بی طرح زانو سے جانا نکی یہ سر تکیہ پہ ہم جس طرح رکھوں نہ ٹھیرے گا
اس شعر کے دونوں لفظ ”بی طرح اور“ نہ ٹھیرے گا“ کا انداز دیکھئے

معانی غزل | جس طرح غزل میں ”الفاظ“ درد و بیتابی، بیکسی، جذبات کے اظہار کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اسی
طرح ”معانی“ کا حال ہے، ”مومن“ نے اپنی غزلوں میں اس کا بھی اسی اعتبار سے اہتمام و
محافظ کیا ہے، مثالوں سے ظاہر ہے

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل تم سے میر حم پہ مرنے سے تو آسان ہوگا
معنوی اعتبار سے یہ شعر کتنا بلند ہو گیا ہے؟

جذبہ دل کو نہ چھاتی سے لگاؤں کیونکر آپ وہ میرے گلے دوڑ کے اکبار لگا
کیون لگے دینے خط آزادی کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

پہلے شعر میں چھاتی سے لگانے کے محاورہ میں معنوی خوبیوں کو دیکھئے دوسرے میں پہلے مصرعہ کی رعایت سے غلام

اور صاحب کے الفاظ نے معنوی حیثیت سے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے
اس قسم کے اشعار سے تمام دیوان بھرا پڑا ہے۔

لہجہ | غزل میں ”لہجہ“ کو بھی خاص وقعت اور خاص قوت ہے، مومن کو اس کے ادا کرنے پر بھی غیر معمولی قدرت ہے۔
مثال ملاحظہ فرمائیے۔

دہم آخر بھی تم نہیں آئے بندگی اب کہ میں چلا صاحب
جذبہ نے غیر کے بھی کیا کہیں تاثیر کی آج کیوں آتے ہوئے ہر کام پر رکتے ہیں آپ
مومن خدا کے واسطے ایسا مکان نہ چھوڑ دوزخ میں ڈال خلد کو کوئے بتان چھوڑ
لہجہ کی خوبی کے ہی معنی ہیں کہ مطلب کو اس طرح ادا کرے کہ اس میں تاثیر پیدا ہو جائے، ان اشعار میں یہ خصوصیت ہے
لہجہ کے اعتبار سے الفاظ ”اور معانی میں جو اہتمام ہوتا ہے وہ ”مومن“ کی غزلوں میں بدرجہ اتم موجود ہے
ترکیب و ترتیب | کمال غزل یا کمال شاعری کا انداز ترکیب اور ترتیب سے بھی ہوتا ہے مثلاً:-
اے جذبہ دل وہ شوخ سگر تو اک طرف پیغام ے کے بھی کوئی آیا نہیں ہنوز
ہم تاسحر آپ میں نہیں تھے کیا جانے رہے وہ کس کے گھر رات
جو نقاب اٹھی میری آنکھوں پہ پردا پڑ گیا کچھ نہ سوچھا عالم اس پردہ نشین کا دیکھ کر
اثر غم ذرا بتا دینا وہ بہت بوچھٹے ہیں کیا ہے عشق
ہم نے تفصیل کے لئے عنوان قائم کر کے علیحدہ علیحدہ طور پر مثالیں پیش کی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ”مومن“ کے ہر شعر
میں یہ تمام خوبیاں یکجا طور پر موجود ہیں۔

سلاست زبان | ہم ہیں اور نزع شب ہجر میں جان ہونے تک
صبر آتا ہے کوئی تاب و توان ہونے تک
مجھ پہ عاشق نہیں ہے کچھ ظالم صبر آخر کرے وفا کب تک
لے شب وصل غیر بھی کاٹی تو مجھے آزمائے گا کب تک
یا الہی مجھ کو کس پردہ نشین کا غم لگا سینے میں اندر ہی اندر کچھ گھلا جاتا دل
سر نہ ہیں اس چشم جاوہر میں ہم خاک ڈالیں دیدہ دشمن میں ہم
اعجاز سلاست کے اظہار کے لئے مومن کی حسب ذیل غزلیں قابل ملاحظہ ہیں :-
اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا رنج راحت فزا نہیں ہوتا
مجھے جنت میں وہ صنم نہ ملا حشر اور ایک بار ہونا تھا

آسمان راہ پر نہیں آتا دعوتے خضر بے دلیل ہوا
اسکے اٹھتے ہی ہم جہان اٹھے کیا قیامت تھا دل کا آ جانا
اسی طرح ہر ردیف میں وہ غزلین موجود ہیں جن پر شاعری اور زبان فخر کرتی ہیں۔

مطلع غزل میں مطلع اور مقطع شاعری اور جذبات کی ابتدا اور انتہا میں مشکل سے کوئی شاعر ایسا ملتا ہے جس کے مطلع اور مقطع دونوں بہتر ہوں۔

”مومن“ میں یہ کمال موجود ہے۔ چند مطلع قابل ذکر ہیں

آخر امید ہی سے چارہ حرمان ہوگا مرگ کی آس پہ جینا شرب حیران ہوگا
دیدہ حیران نے تماشا کیا دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
مین نے تمکو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا مین نے تم سے لیا کیا اور تم نے مجھے کیا کیا
امتحان کے لئے جفا کب تک التفات ستم ناکب تک
شام سے تا صبح مضطرب صبح سے تا شام ہم ایک عالم میں ہیں کیوں لے گردش ایام ہم
دل آگ ہے اور لگائیں گے ہم کیا جانے کسے جلائیں گے ہم

مقطع یہ بیجا مشہور نہیں کہ مقطع ”مومن“ کا حصہ ہے چند مثال اسکی بھی دیکھ لیجئے۔

اے تب ہجر دیکھ مومن ہیں اے تب ہجر دیکھ مومن ہیں
بتخانہ میں ہو کر ترا گھر بتخانہ میں ہو کر ترا گھر
نکل کے دہر سے مسجد میں جا رہے مومن نکل کے دہر سے مسجد میں جا رہے مومن
عمر ساری تو کٹی عشق بتان میں مومن عمر ساری تو کٹی عشق بتان میں مومن
بتخانے سے نہ کہنے کو تکلیف دے مجھے بتخانے سے نہ کہنے کو تکلیف دے مجھے
دوستی اس صنم آفت ایان سے کرے دوستی اس صنم آفت ایان سے کرے

”مومن“ نے غزل کے ہر صنف میں اشعار کہے ہیں، ان کے اشعار عاشقانہ بھی ہیں رندانہ بھی، ظرافت بھی جھلمکتی ہے، شراب کی ستائش بھی لیکن کسی صنف کو اپنے خاص رنگ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

واعظ اور ناصح کو بڑے بڑے متین اور مہذب شعرا نے بے نقط سنائی ہیں اور اس میں وہ تمذیب اور شرافت کی حد سے گزر گئے ہیں، میرا ایسے خود دار و غیور متین و مہذب شاعر نے بھی اس رنگ میں یہ کہا ہے:

مومن کو اس رنگ میں دیکھئے :۔
میں داڑھی ترمی عظم مسجد ہی میں منڈواتا
پر کیا کروں ساتھ اپنے حجام نہیں کھتا

اس وسعت کلام سے جی تنگ آ گیا
ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا
کیا پوچھتا ہے تلخی الفت میں بندگو
ایسی تولد تین ہیں کہ تو جان کھا گیا
حورون کی ثنا خوانی و عظیم یونہی کبانی
سے آ کہ ہے نادانی باتوں میں بہل جانا

”مومن“ نے جہان کہیں ”خمریات“ میں مستانہ مضمون لکھے ہیں وہاں بھی حدود شرعی سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔
استاد مولانا آسی رحم سکندر پوری فرمایا کرتے تھے کہ ”شعر ایسا ہونا چاہئے کہ بر سر منبر پڑھا جاسکے“
یہ تعریف ”مومن“ کے کلام (غزل) پر صادق آتی ہے۔

باقی — باقی

کیفی چریا کوٹی

عطر

تیل

عطر

ہر ماہ بین دس روپیہ کا عطر بطور تحفہ

اگر آپ کو ایسے عطرون کی خواہش ہے جو آپ کے دماغ کو تروتازہ کر دیں۔ اور جن کے لگانے سے آپ کو یہ معلوم ہو کہ آپ
بھونکنے کی بجائے بھینے ہیں۔ تو ہمارے نئے طریق سے تیار کردہ عطرون کا استعمال کریں جو میسور گورنمنٹ کے کارخانہ کے خالص صندل کے
تیل میں تیار کئے جاتے ہیں۔ گو ہمارے پاس ہر قسم کے قیمتی سے قیمتی عطر موجود ہیں لیکن مندرجہ ذیل سستے عطر دیکھ کر آپ کو یقین ہو جائے گا کہ ہم سفارش کرتے ہیں
عطر حبیبی۔ عطر گلاب۔ عطر سوسن۔ عطر عباسی۔ عطر تیریزی۔ عطر سنگترہ۔ عطر کرنا۔ عطر زکس۔ عطر شمس۔ ہر ایک عطر فی تولہ ان کے علاوہ حبیبی۔ گلاب۔ سوسن۔ تیریزی
سنگترہ اور زکس کے عطر تین پانچ۔ آٹھ روپیہ تولہ اور اس سے زیادہ قیمت کے مل سکتے ہیں (ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر ماہ بین قرعہ ڈال کر اپنے گاہکوں سے پہلے تین نمبروں پر
رہنے والوں کو پانچ روپے۔ تین روپے اور دو روپے کے عطر بطور تحفہ بھیجا کر شکے۔ اگر آپ اپنی دنیا کے انعام میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔ تو فوراً اپنی درخواست بھیجیں
ہمارا دلکش ابیر آئیل۔ بادام روغن۔ زیتون اور تلون کے تیل سے مرکب مفید ادویہ سے تیار کردہ خوشبودار تیل فی سیر عہ اور پاؤ بھر کی بوتل
ہمارے ہاں کی باون کیلئے بہترین تیل ہے۔ فوراً منگو اور دیکھیں۔ درخواست دیتے وقت رسالہ کا حوالہ ضرور دیں۔

دلکش پرفیومری کمپنی۔ قادیان۔ ضلع گورداسپور (پنجاب)

انتظار

(افسانہ)

یہ افسانہ ٹامس ہارڈی "انگلستان کے مشہور ناول نگار کے ایک افسانہ کا چربہ ہے۔ اس افسانہ میں مین نے بہت کچھ تصرف کیا ہے۔ تاہم افسانہ نگار کا جو مقصد تھا وہ اپنے حال پر قائم رکھا گیا ہے۔

محشر عابدی

(۱)

انتظار نام ہے تنہاؤن کی دنیا کا، انتظار کا ختم ہونا اس دنیا کا فنا ہو جانا ہے، کائنات انتظار میں وہ تمام رنگین بستیوں میں جاتی ہیں اور ان تمام سترتوں کی روشنیوں جگمگانے لگتی ہیں جن سے قلب انسانی کو بہت گہرا رہتا ہے۔ اس دنیا میں کسی کی آمد۔ کسی کی ملاقات، کسی کا میاں، کسی مراد اور کسی لطف کا انتظار نشوونما پاتا رہتا ہے۔ وہ نشوونما پاتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی عمر کا وہ آخری اور طربناک لمحہ آ پہنچتا ہے جب منتظر کو سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر مطلوبہ شے کو پالنے کے بعد انتظار کی سرستیں ختم ہو جاتی ہیں

غرض منتظر، اپنی آرزو اور خواہش سے واصل ہونے کے بعد بالکل ویسا ہی بن جاتا ہے جیسے کسی ہرے بھرے درخت سے پھول پھل ٹوٹ جائیں، جیسے کسی خوبصورت طاؤس کے پر نوچ لئے جائیں یا جیسے کوئی تھپڑ کا ایکڑ اپنی تمام آرائشوں سے محروم کر دیا جائے۔

(۲)

صابرہ کی غمگین زندگی گویا انتظارِ مجسم تھی۔ وہ حسین تھی، لیکن نہ اتنی حسین کہ حور کا دھوکہ ہو، شاید اب سے کچھ عرصہ قبل وہ ایسی ہی رہی ہو لیکن اب اس میں نہ کوئی ساحریت تھی اور نہ اور کوئی خصوصیت کیونکہ اس کی زندگی، ناکامیوں اور مایوسیوں کا گہوارہ بن چکی تھی، وہ ایک کمزور اور نازک بدن عورت تھی، اور اس کی عمر بیس برس کی تھی، اس کے اعضا بہت متناسب اور موزون تھے لیکن اب ان میں انحطاط نمودار ہو چلا تھا۔ اس کے رخسار جو کسی وقت گلاب کی طرح چمکتے تھے اب ان پر زردی چھا گئی تھی۔

صابرہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی، اور قسمت سے اس کی شادی بھی ایک غریب ہی خاندان میں ہوئی تھی لیکن شادی کے بعد یہ ضرور تھا کہ دونوں میان بیوی انتہائی الفت و محبت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

مگر انقلاباتِ زمانہ اور گردشِ ایام نے انھیں اس غریبی میں بھی سکون سے ایک ساتھ بیٹھنے نہ دیا۔ اور وہ وقت بہت جلد آ پہنچا کہ میان بیوی ایک دوسرے سے ایک نامعلوم زمانہ کے لئے جدا ہو جائیں

(۳)

”صابرہ، خدا کو یہی منظور تھا۔ اس کا غم نہ کرو۔ اگر میں زندہ رہا تو بہت جلد واپس آؤں گا۔“ شاہد نے صابرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا جب وہ ایک گوشہ میں بیٹھی ہوئی اپنے تارک مستقبل پر غور کر رہی تھی صابرہ تھیں کیا خبر کہ تمہارے بعد میری کیا حالت ہوگی۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔“ اس کی سرنگین اور پُر نور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

شاہد:۔ تمہیں رونانا چاہئے۔ صابرہ تھیں صبر و استقلال سے کام لینا چاہئے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ جنگ سے واپس آنے کی امید باقی نہیں رہتی۔؟

صابرہ:۔ ہاں میں تو یہی سمجھتی ہوں شاہد۔۔۔ مگر میری زندگی وبال ہو جائیگی۔ شاہد:۔ صابرہ تھیں اس قدر جلد مایوس نہونا چاہئے۔ کیا تم خدا کو بھول گئی ہو؟ کیا ہماری آئندہ ملاقات کو محض ایک وہم تصور کرتی ہو۔ صابرہ اگر تمہارا یہی حال رہا تو مجھے کہیں بھی چین نہیں مل سکتا۔ اور میں کچھ نہ کر سکتا گا۔ صبر سے کام لو۔ اور خدا پر بھروسہ کرو۔ اس کی قدرت سے تو یہ بات بعید نہیں ہے۔ صابرہ:۔ مگر آہ میرا دل تو بے قابو ہوا جاتا ہے شاہد مجھے ضبط نہیں ہو سکتا۔

وہ رونے لگی شاہد نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اس طرح دونوں میان بیوی بہت دیر تک اُٹے رہے۔

(۴)

آغاب کی شعا عین صابرہ کے حرمان نصیب کا شانہ پر سیاہ باد لون کی طرح چھائی ہوئی تھیں۔ وہ گھر سے اٹھ کر ایک دیران چمن کے ایک ویران کو نہ میں بیٹھی ہوئی اپنی بد نصیبی پر ماتم کر رہی تھی۔ اور کیوں نہ کرتی جب دنیا میں خدا کے سوا کچھ اور کوئی سہارا نہ تھا۔ یہ جدائی اُسے اس قدر شاق گذری کہ کئی دن تک کھانا پینا حرام ہو گیا۔ اس جدائی نے گویا اس کے تمام جسم کی روح نکال لی تھی اور صرف دماغ میں اس کا اثر باقی رہ گیا تھا وہ ابے نیامین تنہا تھی۔ تنہا اور بالکل اکیلی۔ اُس کی سانس اور سر عرصہ ہوا کہ مریچکے تھے۔ صرف صابرہ کی مان زندہ تھی۔ شادی کے کچھ دنوں کے بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ مان کی جدائی نے صابرہ کو بہت تکلیف پہنچائی اور ابھی وہ غم دل سے بھولانہ تھا کہ شوہر کی جدائی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب اس صدمہ کو برداشت کرنیکی طاقت اس میں بالکل نہ رہ گئی تھی اس وقت اس کی حالت بالکل اُس جہاز کی طرح تھی جو طوفان میں اچھکے ہوئے رہا ہو اور جس کے بچنے کا یقین بالکل مومس سی شکل اختیار کر چکا ہو۔ اس کی زندگی گزارنے کا سوا ایسا اس کے اور کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ان تباہ مصیبت کو کاٹے۔ کیونکہ شاہد جو کچھ دے گیا تھا وہ رقم بہت مختصر سی تھی۔ لیکن اس نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ جہاں بھی رہے گا تنخواہ بھیجتا رہے گا۔

(۵)

شاید کوئے چار سال کا عرصہ گزر گیا۔ لیکن نہ کوئی خط آیا۔ نہ روپیہ جو کچھ رقم موجود تھی صابرہ نے نہایت کفایت شعاری سے صرف کی۔ اور اب سلائی وغیرہ پر نوبت پہنچ گئی تھی۔ ایک ایک دن اس کے لئے کوہ الم معلوم ہوتا تھا۔ روزانہ اہر وقت اسے شاید کا خیال رہتا۔ ہر گھڑی شاید کی شکل اس کی نظروں میں پھرا کرتی۔ وہ ہر چیز میں صرف شاید کوئی دیکھتی تھی اکثر اوقات جب اس کی مہربان ہمسائی اس کی خیریت پوچھنے اور مزدوری دینے کو آتی تو اسے شاید کا دھوکہ ہوتا۔ جب بھی باہر نظر اٹھا کر دیکھتی تو اسے ہر شخص پر شاید کا گمان ہوتا۔ لیکن شاید نے آج آتا تھا نہ کل انتظار ایک ہیبتناک جن کی طرح صابرہ پر سوار ہو گیا۔ اور اس کی زندگی کو گریہ و زاری، درد و کرب میں تبدیل کر دیا۔

راتوں کو اکثر سوتے سوتے وہ جاگ اٹھتی۔ اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے لگتے " شاید تمہاری جدائی نے بہت تر پایا۔ دیکھو روتے روتے میری کیا حالت ہو گئی ہے؟ "

وہ ان الفاظ کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھتی۔ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگتی دوڑ کر دروازہ کے پاس پہنچی۔ دروازہ کھول دیتی، باہر غور سے نظر دوڑاتی۔ جہاں صرف شفات چاندنی پھیلی ہوئی ہوتی اور ہر طرف سناٹا طاری رہتا۔ اس منظر سے اس کے دل پر اور چوٹ لگتی۔ وہ ویسے ہی دروازہ کھلا ہوا چھوڑ کر واپس آجاتی۔ پلنگ پر لیٹ جاتی روتے روتے اور کروٹیں بدلتے بدلتے صبح کر دیتی۔

شاید کے انتظار میں وہ بالکل دیوانہ بن گئی تھی، پانی کا کٹورا اٹھا کر منہ تک سے جاتی تو اسے پانی میں شاید کا چہرہ دکھائی دیتا۔ وہ پانی پینا بھول جاتی بعض اوقات آدھا آدھ گھنٹہ تک اسے دوسری گھنٹہ لینے کا خیال نہ آتا

بار بار شاید کا تصور اسے اس قدر بخود بنا دیتا۔ کہ پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھٹ کر گر پڑتا۔ اور اسے خبر نہ ہوتی۔

(۶)

چھ سال ہو گئے لیکن شاید کا کہیں پتہ نہ لگانہ کوئی خط آیا۔ صابرہ کی ہمسائی اس پر بہت مہربان تھی، اسے صابرہ سے محبت تھی اور انتہائی الفت۔ وہ صابرہ کی اس درد انگیز حالت کو دیکھ کر بہت کڑا ہتی تھی۔ وہ صابرہ کا شہ نگرانہ کے لئے اپنی فرصت کا تمام وقت اسی کے پاس رہ کر گزار دیتی اور ہر طرح اسکو تسکین دیتی۔ صابرہ کی اس دردناک حالت پر اسے بہت ترس آتا تھا۔ وہ اس کے غم و الم کو رفع کرنے کی دل و جان سے متمنی تھی۔ لیکن اس کا دور کرنا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ صابرہ اپنی ہمسائی کی باتوں کو غور سے سنتی۔ اس سے کسی قدر اس کی تسلی ہو جاتی۔ لیکن بعض مرتبہ شاید کی یاد اس سے اور تازہ ہو جاتی۔ اس سے برداشت نہ ہوتا اور وہ رونے لگتی، اس کی ہمسائی بھی مجبوراً اس کے ساتھ بیٹھ لگتی

انتظار ایک لامتناہی انتظار تھا جسے صابرہ نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیا تھا۔ وہ سمجھنے لگی تھی کہ خدا نے اُسے اسی انتظار کے لئے پیدا کیا ہے وہ جاننے لگی تھی کہ اسی انتظار میں اس کی زندگی ختم ہونیوالی ہے۔ تاہم اس انتظار میں کبھی کبھی اُسے اُمید کی جھلک بھی نظر آ جاتی۔ ایک طرب آفرین اُمید۔ شاہد سے ملاقات کی اُمید اور اُسے کچھ دیر کے لئے سکون حاصل ہو جاتا۔

ایک دن شام کو جب وہ خاموش بیٹھی کوئی کپڑا اسی رہی تھی۔ دروازہ پر دستک کی آواز آئی۔ وہ اٹھ کر گرتی پڑتی دروازہ کی طرف دوڑی۔ اس کا دل فرط جوش سے سینہ میں اُچھلنے لگا اس کے قدم نہ اُٹھتے تھے۔ دروازہ کھل گیا، لطیف سامنے کھڑا تھا۔

صابرہ یہ منظر دیکھ کر سکتہ کی حالت میں آگئی۔ اُسے اُمید کچھ اور تھی اور نظر آیا کچھ اور، اُس کی اُمید کے خلاف لطیف نے محبت بھری نظروں سے اپنی خالہ زاد بہن کی طرف دیکھا۔ اُسے ایک نامعلوم کیفیت کا احساس ہوا۔ جو اس کے جسم کے ہر رگ و ریشہ میں برق کی طرح سرایت کر گئی۔ صابرہ چونک پڑی اور بیباختہ بھائی بھائی کہہ کر لطیف کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ آنسو۔ محبت کے آنسو۔ درد کے آنسو۔ خون کے آنسو دونوں کی آنکھوں میں ڈبڈبا رہے تھے۔

(۷)

لطیف کی آمد نے صابرہ کے صحیفہ زندگی کا دوسرا ورق الٹ دیا۔ صابرہ کے جذبات نے کروٹ لی۔ چھ سال کی سوئی ہوئی خواہشیں آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھیں۔ لطیف کے جسم کو جب اس کے ہاتھوں نے مس کیا تو اس کو اپنے اندر خون کی ایک گرم لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور وہ جذبہ ایک انوکھی کیفیت میں ظہور پذیر ہوا۔ انوکھی اور بالکل عجیب۔ ”محبت“۔

لطیف کی عمر ابھی تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ ایک تندرست توانا اور خوش رو جوان تھا اس کی شادی ہو چکی تھی۔ لیکن بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ شاہد سے ملنے کے لئے آیا تھا لیکن یہاں کا یہ عجیب سماں دیکھ کر وہ بھی کچھ اور محسوس کرنے لگا۔ یعنی صابرہ سے ایک دلی تعلق۔ اور یہ بات دونوں پر منکشف ہو گئی۔ کہ ان دونوں کے تعلقات میں بھائی بہن کے رشتہ سے مختلف کچھ اور کیفیات پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ جذبہ مخفی طور سے ترقی پذیر ہوتا رہا۔ دونوں میں سے کسی کو اس کے اظہار کی جرات نہوتی تھی کیونکہ ابھی دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کا احترام موجود تھا۔

لطیف، تنہائی کے خیال سے صابرہ کے پاس نہ رہتا تھا۔ بلکہ اس نے علیحدہ مکان لے رکھا تھا۔ اس خوف سے کہ لوگ کسی قسم کا شبہ نہ کریں۔ اس طرح صابرہ کو بھی اطمینان ہو گیا۔ لطیف روزانہ صابرہ کے پاس آتا تھا اور تمام وقت اس سے باتوں میں گزار دیتا تھا۔ اس طرح محبت کے پینگ بڑھتے جا رہے تھے۔ صابرہ شاہد کو کچھ کچھ بھولنے لگی۔ اُسے لطیف کی باتوں میں بہت لطف حاصل ہوتا۔ اور وہ بہت غور سے اُنھیں سنا کرتی تھی۔

کچھ عرصہ اسی طرح گزر گیا۔ ایک دن شام کو جب صابرہ صحن میں بیٹھی ہوئی آسمان پر اُدھرا دھراڑنیوٹے ابر کے ٹکڑوں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ لطیف مکان میں داخل ہوا۔ وہ مسرور تھا اس کے چہرہ سے سکون ٹپک رہا تھا۔ صابرہ نے دیکھا نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ آکر قریب ہی بیٹھ گیا۔ اور کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ صابرہ میں آج تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں شاید تمہیں ناگوار گذرے۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ تم یونہی کب تک انتظار کرو گی؟

صابرہ کے دل میں اس سوال سے ایک بچینی سی پیدا ہو گئی وہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ لطیف کو اس سوال کا کیا جواب دے؟ مشکل تمام اس نے کہا۔ تمہارا کہنا ٹھیک ہے لطیف۔ مگر میں مجبور ہوں

لطیف:- چھ برس کے بعد مجبوری؟ صابرہ تمہیں اپنا خیال کرنا چاہئے۔ تم نے بہت کافی انتظار کر لیا ہے۔

صابرہ:- لیکن تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟

لطیف:- میرا مطلب؟ — صابرہ تم خود سمجھ سکتی ہو۔ لطیف تمہاری ہر خدمت کے لئے تیار ہے یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا اور صابرہ کے چہرہ پر آنکھیں گڑا دیں۔ صابرہ لطیف کے آخری جملہ پر غور کر رہی تھی اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اپنے ناخن پر نظرین جمائے تھی۔ اس نے دیکھا — اس نے تصویر میں دیکھا کہ شاہد سامنے کھڑا ہے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بہت دیر تک وہ آنکھیں بند کئے رہی۔ لطیف سکوت کے ساتھ صابرہ کی ان وجدانی کیفیات کا مشاہدہ کرنے لگا۔ اور اس کی محبت اور شوہر پرستی کی عبادت کا جو اس کی حرکات سے سرزد ہو رہی تھیں مطالعہ کرتا رہا۔ صابرہ نے یکایک آنکھیں کھول دیں۔ اُسے شاہد کے آنکلی نئی اُمید پیدا ہو گئی۔ اس نے لطیف سے کہا۔ ”لطیف ابھی ایک سال اور انتظار کرو۔“

(۸)

انتظار کی گھڑیاں، ہزاروں ارمان اور آرزوؤں کے ساتھ گزرتے لیکن اور دونوں کے لئے ایک ہی طرح کی بچپنیاں پیدا کرنے لگیں۔ لطیف صابرہ کے عیش و آرام کا خیال حد درجہ ملحوظ رکھتا تھا اس نے اس کی آسائش کیلئے ہر قسم کا سامان مہیا کر دیا تھا۔

دن گزر گئے۔ ہفتے گزر گئے۔ مہینے گزر گئے۔ سال ختم ہونے لگا اور صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تو لطیف نے صابرہ سے دریافت کیا کہ شادی کی تیاریاں شروع کر دی جائیں۔ صابرہ نے جواب دیا ابھی ایک برس اور ٹھہرو۔ شاہد کی یاد صابرہ کے محبت آمیز دل میں ابھی تک باقی تھی۔ ابھی شاہد کا تصور کلیخت فنا نہوا تھا۔ لطیف کی تمنا تھی کہ جلد یہ وقت کسی طرح گزر جائے۔ صابرہ کی آرزو تھی کہ یہ دن بڑھتے چلے جائیں شاید اس اتنا دیر شاہد آجائے۔ دوسرا سال بھی گزر گیا

صابرہ نے لطیف سے خواہش کی کہ ابھی ایک ماہ اور صبر سے کام لو۔ لطیف کو مجبوراً صابرہ کی باتوں کو ماننا پڑتا تھا

اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن اب اُسے یقین ہو گیا کہ یہ زمانہ بہت قلیل ہے۔ اور شاید اب عقد میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو۔ ایک ماہ کا زمانہ ختم ہو گیا۔
لطیف نے ایک دن صابرو سے پوچھا۔ صابرو آج ایک ماہ بھی ختم ہو گیا۔ اور اب شاید تھیں کوئی عذر نہ ہوگا اگر شاید کو آنا ہوتا تو وہ ہنس جاتا۔

صابرو نے جواب دیا۔ ہاں لطیف یہ سب ٹھیک ہے لیکن اُمید پر دنیا قائم ہے اگر دو ہفتے اور انتظار کر لو تو کیا مرجھو لطیف!۔ اچھا تو دو ہفتے میں اور ٹھہر سکتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے تمام سامان کر لینا چاہئے۔
صابرو:۔ جیسی تمھاری مرضی ہو۔ لیکن میرا تو یہ خیال ہے ایک ہفتہ کے بعد شروع کرنا۔
لطیف:۔ جیسا تم کہو۔

ایک ہفتہ بھی باتوں ہی باتوں میں گزر گیا۔ صابرو کی آنکھیں انتظار میں تھیں۔ لیکن شاید کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ صابرو نے خیال کیا کہ اب انتظار فضول ہے اور شاید کی واپسی ناممکن شکل اختیار کر چکی ہے آٹھ برس گزرے لیکن کوئی خبر نہیں آئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اب وہ اس دنیا میں نہیں۔ اس کا دل فرط غم سے بھر آیا۔ وہ روتے لگی۔ رات بھر روتی رہی۔

(۹)

نکاح کا دن تھا۔ لطیف نے اپنے اور صابرو کے لئے کپڑے وغیرہ بنوائے تھے اور تمام ضروری سامان لاکر صابرو کو دیا تھا۔ صبح وہ کچھ اور چیزیں لایا۔ اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ شام کو قاضی کو لیکر آئیگا۔ صابرو نے تمام چیزیں لے لیں۔ اپنی ہمسائی کو یہ واقعہ پہلے ہی بتا دیا تھا۔ وہ اس عقد کو شکر بہت خوش ہوئی۔ اس نے عمدہ عمدہ کھانے پکا کر تیار کئے اور شام کو اُسے کپڑے پہنا کر دولہن بنا دیا۔ اور خود اس کے پاس بیٹھی رہی۔ جب لطیف کے آئے گا وقت قریب ہو گیا تو صابرو کے کہنے سے اس کی ہمسائی نے کھانا برتنوں میں نکال کر ایک علیحدہ کمرہ میں جن دیا۔

اب صابرو تنہا بیٹھی تھی۔ اور معلوم نہیں کیا کیا سوچ رہی تھی۔ یکایک دیر میں لگا ہوا تختہ کھونٹی شکل جیہٹکی وجہ سے اُلٹ گیا۔ اور اس پر رکھی ہوئی گھڑی بچے گر کر جوڑے ہو گئی۔ صابرو اس اچانک حادثہ سے گھبرا گئی۔ وہ اٹھ کر گھڑی کے پاس آئی۔ دیکھا تو وہ گولی بڑی ہے۔ یہ گھڑی اس کے والد کی نشانی تھی جسے وہ بہت عزیز سمجھتی تھی۔ اور انھماں تکلیف کا وقت بھی اُسے فرحست کرنے کا خیال نہ کیا تھا۔ اس اثنا میں ہمسائی بھی گھبرائی ہوئی آگئی۔ اور اس نے پوچھا کیا ہوا؟

صابرو نے حسرت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ گھڑی آپ ہی آپ گر کر ٹوٹ گئی۔
ہمسائی نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا۔ یہ سنگین تو اچھا نہیں ہے۔

یہ سن کر صابرہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یوں تو ٹوٹنے ہی کا صدمہ اُسے کیا کم تھا مگر اب اس شکون کو سُکر اور بھی قلع پیدا ہو گیا۔ لیکن آئیوالی کھڑیاں زیادہ نازک تھیں اور چونکہ مستقبل میں عشرت کی چمک نظر آرہی تھی اس لئے اُس نے اس واقعہ کا زیادہ خیال نہ کیا اور لطیف کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ دو سات بج چکے تھے، اس وقت صرف صابرہ مکان میں تھی۔ اس کی ہمسائی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ دروازہ کی کُٹھی کھٹکھٹانی آواز آئی۔ دروازہ کھولنے کو کوئی اور موجود نہ تھا۔ خود صابرہ کو اٹھنا پڑا۔ اُس نے خود جا کر دروازہ کھول دیا۔ اُسے یقین تھا کہ لطیف آیا ہوگا۔ مگر اس کے عجیب کی کوئی انتہاء نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ایک شخص ایک صندوق اور بستر پر بٹے ہوئے کھڑا ہے صابرہ کو دیکھ کر مزہور نے کہا۔ یہ سامان شاہد میان نے بھیجا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر کے بعد آئینگے۔

یہ لفظ بجلی کی طرح صابرہ کی آنکھوں میں کود گئے۔ اُسے معلوم ہوا کہ زمین اس کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ تختِ اشری میں دہنستی چلی جا رہی ہے اس وقت اس کے اضطرابِ قلب اور بدحواسیوں کا منظر دیکھنے سے قلع رکتا تھا۔ وہ جون کی تون کھڑی رہی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی، جسے وہ خود نہ سمجھ سکتی تھی۔ وہ کچھ دیکھ رہی تھی لیکن اُسے سب بالکل خواب معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے اس مزدور کی آمد کو محض ایک تصور سمجھا۔ مزدور نے پھر کہا۔ یہ سامان اندر رکھ دو یا باہر ہی۔ اب صابرہ کو ہوش آیا اس نے مزدور کو پردہ میں ہو کر اندر بلا لیا۔ وہ سامان رکھ کر چلا گیا۔ یہ سامان ایک صندوق تھا جس پر شاہد کا نام لکھا تھا اور جسے صابرہ پہچانتی تھی۔ اور ایک بستر

اس کی سمجھ میں اب کچھ نہ آتا تھا کہ اُس شادی کا اب کیا انجام ہوگا۔ اور وہ شاہد کو اس کا کیا جواب دے گی۔ تاہم اسکے افسردہ دل و دماغ میں سہرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسرور ہو گئی۔ اس کے رخساروں میں گلابی رنگ عود کر آیا۔ ہنسٹم ہونٹوں پر چمکنے لگا۔ وہ نئے سرے جوان ہو گئی۔ اتنے میں ہمسائی بھی آ گئی۔ صابرہ نے اس سے سارا حال بیان کر دیا۔ اور سامان بھی دکھایا۔ ہمسائی نے پوچھا۔ پھر اب لطیف کو کیا جواب دو گی؟ صابرہ نے جواب دیا۔ کیوں؟ میں سب حال اُن سے کہہ دوں گی

ہمسائی بولی۔ لطیف ابھی تک نہیں آئے۔ آٹھ بجے چاہتے ہیں۔ اب میں جاتی ہوں ضرورت ہو تو بلا لینا ہمسائی چلی گئی صابرہ اب پھر تنہا رہی۔ اور شاہد کا خیال اب اس کے دماغ میں سمایا ہوا تھا لطیف کے متعلق گویا وہ بالکل کچھ جانتی ہی نہ تھی۔ لطیف نے دروازہ پر قدم رکھا تو وہ چونک پڑی۔ لطیف اُسے لباس عروسی میں دیکھ کر خوش ہو گیا۔ وہ اندر داخل ہو کر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ صابرہ نے کہا۔ ”لطیف تم نے کچھ اور بھی سنا؟“

لطیف نے کسی قدر گھبرا کر سوال کیا۔ کیا؟

صابرہ نے جواب دیا۔ ”مختار سے بہنوئی کا سامان آیا ہے اور وہ آنے ہی واسے ہیں“

اس جملہ نے لطیف کی ساری تمنائوں پر پانی پھیر دیا۔ اس پر یہ الفاظ صاعقہ بن کر گرے اسکے جذبات میں

ہل چل چم گئی۔ وہ بالکل دیوانہ سا ہو گیا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلتی تھی۔ مشکل تمام اس نے کہا: ”اچھا تو صابرہ
میں جاتا ہوں۔ پھر آؤنگا“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا

(۱۰)

۹ بج گئے۔۔۔ دس بج گئے۔ گیارہ بج گئے۔ شاہد کا ابھی تک پتہ نہ تھا۔ صابرہ بار بار دروازہ کھول کر چھانکتی لیکن
سڑک پر سناٹا چھایا رہتا۔ یا کبھی کبھی دوڑ جانے والے لوگوں کے قدموں کی آواز گوش گزار ہوتی تھی، جن پر اسے شاہد کے
آنیکا دھوکہ ہوتا تھا۔ وہ تنہا بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ اس نے ہمسائی کو بھی نہ بلایا کہ اس کی نیند خراب ہو گئی۔ انتظار ہی
انتظار میں بارہ بج گئے۔ نیند اس کی آنکھوں سے اڑ گئی تھی۔ اُسے ہر وقت یہی معلوم ہوتا تھا کہ شاہد اب آتا ہی چاہتا ہے۔
اس ایک خیال کے ساتھ ہی نئی امنگوں اور طرح طرح کے ویولون کا اس کے دل پر اثر سا چھا جاتا۔ اور وہ خود کو بہت
خوش نصیب سمجھنے لگتی۔ لیکن جب پھر گھنٹا بجنے کی آواز آتی۔ تو یہ خیال یا اس کی گھٹا بجاتا۔ اور پھر نظروں سے اوجھل
ہو جاتا۔

دو بج گئے۔ تین بج گئے۔ چار بج گئے۔ شاہد کی صورت اب تک نظر نہ آئی تھی لیکن صابرہ، وفا کی دیوی،
پیت کی ماری، پتی کی بچاری، اب تک لباس عروسی میں بیٹھی گر سنہ نگاہوں سے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ کھانا دسترخوان پر
رکھے رکھے برتن ہو چکا تھا۔ صبح ہو گئی

ہمسائی صابرہ سے ملنے کو آئی۔ اس نے دیکھا تنہا صابرہ بیٹھی ہوئی ہے اُسے تعجب ہوا کہ کیا معاملہ ہے اس نے حیرت
سے پوچھا: ”تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو؟“ شاہد نہیں آئے۔
صابرہ نے جواب دیا: ”نہیں ابھی تک تو نہیں آئے۔“
ہمسائی بولی: ”پھر اب کیا ارادہ ہے۔“

صابرہ نے کہا: ”کچھ نہیں۔ شاید اس وقت آجائیں۔“
دن بھر اسی اُمید افزا انتظار میں گذر گیا لیکن شاہد نہ آیا۔

(۱۱)

شاہد گاڑی سے اتر کر اسٹیشن کے باہر آیا۔ اس نے ایک مزدور کو اپنا سامان دیکر اپنے گھر کا پتہ بتا دیا تھا۔ اور سامان
پہنچانیکو کھدیا تھا۔ وہ خود ایک ہوٹل میں کسی ضرورت سے ٹھہر گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ وہاں سے نکل کر گھر کی طرف
روانہ ہوا تو۔ راستہ میں پستول کی آواز سنائی دی۔ گولی، شاہد کو لگی اور وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ پولیس نے اُس کو ہسپتال
پہنچا دیا۔

لطیف کا دل ٹوٹ گیا تھا وہ نہایت مغموم تھا۔ مغموم اور مضطرب بھی۔ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ کچھ نہ کر سکتا تھا

وہ سب کچھ کرنے سے مجبور تھا۔ دوسرے کی چیز پر کسی کا کیا بس؟ وہ اپنی نادانی پر تاسف کرتا رہا۔ اس نے اب صابرہ کے پاس جانا مناسب نہ سمجھا اور اس کی طبیعت بھی نہ چاہتی تھی۔ دوسرے روز وہ وہاں سے اپنے گھر واپس چلا گیا۔ شاہد کے انتظار میں دن گزرے، راتیں گزریں۔ ہفتے گزرے، مہینے گزرے اور سال تک نوبت آپہنچی پھر اس کی کوئی خبر نہ معلوم ہوئی۔ کہ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان وہ زندہ ہے یا مر گیا ”کئی سال گزر گئے“

صابرہ کی امیدیں ناکامیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اس کی جوانی انتظار کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اُتاری جا چکی تھی اس کی شوخیان سنجیدگیوں میں کم ہو چکی تھیں، اس کی رعنائیاں ضعف کا نقشہ بن گئی تھیں۔ اس کا حسن لٹ چکا تھا اس کی شوہر پرستی ایک تصویر خیالی بن کر رہ گئی تھی۔ اور وہ ایک ڈھانچہ تھی۔ چند ہڈیوں کے مجموعہ کا۔ ایک ضعیفہ تھی جس کے بالوں میں سین چمک تجربہ کاری کی منظر تھی۔ اس کے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور اس کی بینائی میں بھی فرق پیدا ہو گیا تھا۔

”اب بھی صابرہ شاہد کا انتظار کر رہی تھی“

صابرہ میں اب صرف سانس باقی رہ گئی تھی۔ ورنہ حقیقی معنوں میں وہ مردہ تھی۔ یہ سانس صرف شاہد کے نام سے وابستہ تھی۔ کہ شاہد اب بھی شاہد آجائے۔

دنیا گردش کرتی رہی، سورج نکلتا اور غروب ہوتا رہا۔ چاند جگمگاتا اور چھپتا رہا۔ دن رات آتے جاتے رہے۔ سردی اور گرمی اپنے وقت پر ظہور پذیر ہوتی رہتی۔ لیکن شاہد بالکل خیال، اور خیال سے بھی نازک کوئی شے بن گیا تھا۔ جو دماغ میں بھی نہ آ سکتا تھا۔

ایک رات جب تمام آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بجلی زور زور سے کوندر ہی تھی۔ دریاؤں گرج رہے تھے۔ پانی کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ صابرہ اپنے گھر میں بیٹھی ہوئی قدرت کے ان بھیانک مناظر کا اکیلی مشاہدہ کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس بارش اس رات کی تاریکی، چمکنے والی بجلی اور گرجنے والے بادلوں سے شاہد کا پتہ پوچھ رہی تھی۔ یکایک دروازہ کھل گیا۔ لیکن اُسے خبر نہ ہوئی وہ معلوم نہیں کس خیال میں مجھتی۔ وہ دفعۃً چونک پڑی۔ اس نے دیکھا۔ خور سے اور آنکھیں گڑا کر، سامنے ایک انسان کھڑا تھا۔ ایک لاغر، نحیف اور لمبی دائرہ والی انسان۔ جس کا تمام جسم پانی سے تر ہو رہا تھا۔ آئیو اے کے منہ سے نکلا۔ ”صابرہ“۔ اور صابرہ آندھی کی طرح اُٹھی اور تیر کی طرح اس کے پاس جا پہنچی مگر صرف یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلے۔ ”شاہد مجھے تمہارا ہی انتظار تھا“

اس نے اپنے دونوں ہاتھ شاہد کے گلے میں ڈال دیے اور اس کی روح شاہد کے پاس سے پھر اس کے جسم میں اُپس نہ آئی

محشر عابدی۔

حکومت برطانیہ کی وسعت کاراز

فتح ہندوستان کے مختلف مناظر

سرجان سیلی کے پانچ لکچرون کا ترجمہ دسمبر ۱۹۲۹ء تک شائع ہو چکا ہے یہ چھٹے لکچر کا ترجمہ ہے

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا اسکا حاصل یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسا نتیجہ پیدا ہوا جو اتنا حیرت انگیز نہیں جتنا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ نتیجہ اپنی عظمت کے لحاظ سے ضرور قابل لحاظ ہے اور پھر اس سے آئندہ جو نتائج پیدا ہونے والے ہیں وہ بھی نہایت مہتمم باشان ہیں

اس سے قبل میں نے اس سلطنت کی ایک خصوصیت پر زور دیا تھا کہ جو قوت اس سلطنت کو انگلینڈ سے وابستہ کرتی ہے بالکل برائے نام ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری سلطنت ہندو نوآبادیات سے مشابہ ہے، البتہ ان دونوں میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ ہماری خاص نوآبادیان اکثر معاملات میں اپنی حکمت عملی کا تعین خود کرتی ہیں کیونکہ وہاں کی حکومت مجلس قانون ساز کی ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے اور ہندوستان کو ایسی آزادی رائے حاصل نہیں ہے، یہاں تک کہ وائسرائے بھی اپنے فیصلوں میں سکرٹری آف اسٹیٹ کا تابع ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بڑی مشابہت ان دونوں میں ہے کہ ہندوستان نوآبادیوں کی طرح ہمیشہ الگ رکھا گیا، اسکو ہوم گورنمنٹ سے کبھی اس قدر قریب نہیں ہونے دیا گیا کہ اسکے ساتھ مل جائے یا اسکی صورت میں تبدیلی پیدا کر دے یا اسکے آزادانہ ارتقا میں مزاحم ہو سکے۔ ہندوستان، نظام حکومت اور اقتصادی اعتبار سے ایک آزاد سلطنت ہے۔ اگر سلطنت مغلیہ اپنی اسی قوت کیساتھ آج تک باقی رہتی تو انگلینڈ کی تاریخ خارجی معاملات میں آج سے بہت زیادہ مختلف ہوتی فرانسیسون کے ساتھ ہماری لڑائیوں کا رخ اور ہی کچھ ہوتا خصوصاً اس جنگ کا جس میں بونا پارٹ کی مہم ایک خاص واقعہ ہے۔ ہمارے خیال میں جنگ کریٹیا کبھی نہ ہوئی ہوتی اور نہ ہم جنگ ترکی دروس میں اس قدر بچپنی لیتے لیکن حکومت انگلینڈ کا کانٹنی ٹیوشن بجٹسہ ہی ہوتا اور ہماری خانگی تاریخ کی رو بھی بالکل وہی ہوتی جو آج ہے میرے خیال میں صرف ایک مرتبہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان پارلمنٹ کی بحث میں شریک ہوا، اسوقت اسنے ساری سیاسی دنیا کی توجہ جذب کر لی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے عذر میں بھی جب کہ ہمارے جذبات حد درجہ مشتعل تھے، ہماری خانگی سیاست کی رو پر ہندوستانی معاملات کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

اس لئے اگر سلطنت ہند ہم کھودین تو اسکے فوری اور خالص سیاسی اثرات کچھ زیادہ قوی نہیں ہونگے سکرٹری

آف اسٹیٹ کا عہدہ ختم ہو جائیگا، پارلیمنٹ کا کام ہلکا ہو جائیگا اور ہماری خارجی پالیسی پر سے ایک بڑا بھاری بوجھ اتر جائیگا۔ انکے علاوہ اور فوری تغیرات کچھ زیادہ نہ ہونگے۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ سلطنت ہند اس معنی میں نوآبادیوں سے مشابہ ہے اور اسکے اندر ہم توسیع انگلستان کی وہ خصوصیت پاتے ہیں جو میرے ان لکچروں کا موضوع ہے۔ میں اپنے ہی بیان کو چکا ہوں کہ یہ توسیع نظر اول میں عضلاتی (Muscular) کی قسم کی نہیں معلوم ہوتی۔ جب بچہ بڑھکر مرد ہو جاتا ہے تو بچہ غائب ہو جاتا ہے۔ اسکے اندر کوئی ایسی ترقی نہیں ہو جاتی جو اصلی بچے سے مختلف ہو یا کوئی ایسی چیز نہیں مل جاتی جو آسانی علیحدہ کی جاسکے لیکن انگلینڈ کی توسیع ٹھیک نین معنوں میں ہوئی ہے۔ کیونکہ اصلی انگلینڈ اب بھی برطانیہ کلان کے قلب میں بجنسہ نظر آ رہا ہے۔ اسکے اعضاء ترکیبی بذات خود مکمل ہیں۔ ابھی تک اُسے اپنے ساتھ ہندوستان اور نوآبادیوں کا خیال ہی نہیں کیا اور نہ اسکی عادت ڈالی۔

ٹرگوٹ (Trugot) نے نوآبادیوں کی مثال اُس پھل سے دی تھی جو صرف پکنے تک درخت سے لٹکتا رہے تمام انگریزی اقوام کو بمقابلہ ایک فرد کے ایک خاندان سے تشبیہ دینا یقیناً زیادہ موزون ہوگا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملکہ الزبتھ کے عہد کے انگلینڈ کا ایک وسیع کنبہ دور دراز سمندر پار ممالک میں پھیلا ہوا ہے، جسکے اندر غالب حصہ خوشحال نوآبادیوں کا ہے لیکن اُسکے اندر ایک ایسا کارپوریشن بھی شامل ہے جو تجارت کرتے کرتے خوش قسمتی سے ایک عظیم الشان ملک پر تسلط ہو گیا اس قسم کا خیال کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ یہ خیال خیال، کی حد سے متجاوز ہو کر دلیل و حجت نہ بن جائے لیکن ہم جانتے ہیں کہ خاندان، کم از کم موجودہ سوسائٹی کے رواج کے مطابق انحطاط پذیر ہوتا ہے۔ جب تک لڑکے چھوٹے ہوتے ہیں اس میں اتحاد ہوتا ہے، بعد ازاں یہ ایک باہمی عہد و پیمان کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر جب لڑکے بڑے ہو جاتے ہیں تو یہ عہد و پیمان بھی ڈھیل پڑ جاتا ہے۔ آخر الامر جب لڑکے جوان ہو کر تلاش روزگار میں ادھر ادھر نکل جاتے ہیں اور لڑکیاں بیاہ دی جاتی ہیں تو پھر خاندان میں عملی طور پر کوئی عہد و پیمان باقی نہیں رہتا بلکہ اکثر ہمیشہ کے لئے اسکے ارکان میں کوئی رشتہ باقی نہیں رہ جاتا۔ ہم اپنی سلطنت کو ایک خاندان کہہ سکتے ہیں لیکن بغیر مزید تحقیقات یہ فرض نہیں کر سکتے کہ اسکا بھی ہی حشر ہونیوالا ہے۔ کیونکہ وہ اسباب جو خاندانوں کی شکست کے باعث ہوتے ہیں ٹھیک حکومتوں کے نہیں ہوتے۔ یہ امر خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے کہ اب اُن اسباب کا اثر اس قدر نہیں ہوتا جس قدر پہلے ہوا کرتا تھا۔ ٹرگوٹ اور انقلاب امریکہ کے زمانہ میں البتہ ایک دور افتادہ محکوم ملک کو اس لڑکے سے تشبیہ دیتے تھے جو مکان چھوڑ کر عملی طور سے خاندان سے الگ ہو گیا ہو۔ لیکن زمانہ حال میں ایسا نہیں ہے کیونکہ ایجادات نے سارے کوہ زمین کو سمیٹ کر ایک جگہ کر دیا ہے۔ چنانچہ ریاستہائے متحدہ اور روس میں ایک ایسی جدید طرز کی اور اتنی وسیع سلطنت قائم ہو گئی ہے جسکا گزشتہ زمانوں میں کسی کو علم بھی نہیں تھا۔ چونکہ انگلینڈ کا تعلق نوآبادیوں اور ہندوستان سے جبرت انگیز طریقہ پر بہت کم رہا ہے لہذا قدرتنا ہم کو اس تعلق کے نتیجہ پر غور کرنے میں تامل ہوگا۔ لیکن نتیجہ بالکل واضح ہے۔ نوآبادیوں کے متعلق میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ اگرچہ جبریت

انکا تعلق مادر وطن سے کم تھا، تاہم یہ تعلق رفتہ رفتہ بجائے کمزور ہونے کے زیادہ استوار اور ترقی پذیر ہوتا جاتا ہے۔ نوآبادیوں اب ہم سے بہت زیادہ قریب ہو گئی ہیں، گزشتہ زمانہ میں جو خرابیاں ان کے اندر تھیں دور ہو گئیں اور اب تو وہ ہماری فاضل آبادی کیلئے ایک قدرتی نکاس کا کام دیتی ہیں۔ برخلاف اسکے اگلے وقتوں میں جب آبادی اس قدر فاضل نہیں تھی تو نوآبادیوں میں بالعموم بدولت پناہ گزین آباد ہوتے تھے، جو وطن سے برسرِ عناد ہوتے تھے۔ یہی اصول ہمارے تعلق ہندوستان میں کارفرما ہے وہ قوت جس پر اس تعلق کی بنا ہے۔ کمزور ہے۔ انگلینڈ نے اس تعلق کی وجہ سے اپنی ترقی روکی نہیں۔ اگرچہ یہ سلطنت (ہندوستان) بہت بڑی ہے لیکن انگلینڈ آج بھی ویسا ہی ہے جیسا اسکے حصول سے قبل تھا۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ تعلق گو صدیوں سے قائم ہے لیکن ہر وقت ٹوٹ سکتا ہے۔ اور اسکی وجہ سے ہمارے خانگی انتظام میں کوئی اتیری نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر اس کے کمزور ہونے کی وجہ سے یہ مستحکم ہو کہ جلد یا بدیر اسکو شکست ہونا ہے تو قبل ازیں کہ ہم اس استنباط کو تسلیم کریں ہمیں ایک اور مسئلہ پر غور کرنا چاہئے۔ یعنی یہ کہ اسکا میلان کس رخ پر ہے۔ آیا یہ بوجہ تعلق رفتہ رفتہ ڈھیلہ ہوتا جاتا ہے یا زمانہ کے ساتھ ساتھ زیادہ مضبوط۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ نوآبادیوں کی طرح زمانہ کا میلان جس نے عظیم الشان سیاسی اتحاد کے امکان کو قوی بنادیا ہے ہندوستان اور انگلینڈ کے باہمی تعلق کو بجائے ضعیف کرنے کے قوی تر کر رہا ہے۔

میں نے اپنی تصنیف ”*India and the World*“ میں ہندوستان کے متعلق جو نوٹ لکھا ہے اس میں وہ کتا ہے کہ اجارہ داری کے زمانہ میں یعنی ۱۸۵۷ء میں انگلینڈ اور ہندوستان کی تجارت نہایت معمولی تھی یعنی اسکو اتنی بھی اہمیت نہیں حاصل تھی جتنی انگلینڈ اور جرمنی یا *Germany* کی تجارت کو تھی۔ لہذا اگر تجارت دو قوموں کو متحد کرنے کے لئے کوئی خاص رشتہ ہو سکتی ہے تو ہم اسکے میلان اور اسکی قوت کا ایک معیار قائم کر سکتے ہیں، خواہ یہ میلان اتحاد کی جانب ہو یا علیحدگی کی جانب۔ چنانچہ ہم ہندوستان اور انگلینڈ کی موجودہ تجارت کا موازنہ گزشتہ تجارت سے کرینگے پرانے زمانہ میں خیال تھا کہ ہندوؤں کے عادات ناقابل تبدیل ہیں اسلئے انہیں یورپ کی مصنوعات کی کھپت نہیں ہو سکتی لیکن اب ہم ہندوستان کی تجارت کا بجائے جرمنی اور *Germany* کی تجارت سے مقابلہ کرنے کے ریاستہائے متحدہ امریکہ اور فرانس کی تجارت سے کرتے ہیں یعنی دو ایسی قوموں سے جو دنیا کی بڑی کاروباری قوموں میں شمار ہوتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ ہمارے ہندوستان سے نسبت بہت کم آمدنی ہے تاہم اسکا نمبر تجارت برآمد کے لحاظ سے فرانس اور امریکہ کے بعد ہے اور درآمد میں اسو اس امریکہ اسکا نمبر فرانس اور تمام دیگر ممالک سے آگے ہے۔ کیونکہ اسی سال (۱۸۸۱ء میں) وہاں کی درآمد ۲۵۰۰۰۰۰ تھی اور ان ممالک کی جبکہ نمبر اسکے بعد تھا جیسے آسٹریلیا اور جرمنی علی الترتیب دو کروڑ ۱۰ لاکھ اور ایک کروڑ لاکھ۔

موجودہ صدی میں جو عظیم ترقی اس باب میں ہوئی ہے اس سے تم اندازہ کر دگے کہ دونوں قومیں بجائے ایک دوسرے سے غلطیہ ہونے کے رفتہ رفتہ قریب ہو رہی ہیں۔ لہذا اگرچہ سیاسی نقطہ نظر سے اس علیحدگی کے اثرات فوری اور

براہ راست نہیں ہونگے تاہم اقتصادی نقطہ نگاہ سے بہت ہی اہم ہونگے۔ ہکو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ محض سیاسی تعلقات کی وجہ سے دونوں ممالک میں تجارتی تعلقات قائم ہیں، اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو شاید یہ تعلقات منقطع ہو جائیں یا اگر وہ کسی یورپ کی سلطنت مثلاً روس کے ہاتھ میں چلا جائے تو ان کا ٹوٹ جانا بالکل یقینی ہے۔ اس صدی کے شروع میں اگر ہم نے چاہا ہوتا تو نہایت آسانی کیساتھ ہندوستان سے علیحدگی کر لی ہوتی کیونکہ وہ ابتدائی لڑائیوں جو فرانسیسیوں سے بمبئی، مدراس اور کلکتہ کی کوٹھیوں کے متعلق ہوئیں ان کے اندر کوئی معقول وجہ نہیں تھی اس لئے کہ اس زمانہ میں ان مقامات پر ہماری تجارت بالکل غیر اہم تھی۔ لیکن اب یہ بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہماری تجارتی پابندیاں بہت زیادہ ہیں یعنی اب ہم ہندوستان سے بہ نسبت پہلے کے زیادہ مضبوطی کے ساتھ بندے ہیں۔ پھر یہ بات غور کرنے کے لائق ہے کہ اس عرصہ میں انگلینڈ اخلاقی نقطہ نظر سے ہندوستان سے کس قدر قریب ہو گیا ہے۔ شروع شروع میں ہکو ہندوؤں کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ ہم محض تاجر تھے، سلطنت منلیہ یا اُس کے زوال سے ہکو کوئی سروکار نہیں تھا، ہکو اس سے کوئی بحث نہیں تھی کہ آیا ہندو خراب حکومت میں رہتے تھے یا مسلح لوٹروں کے شکار بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہندوستان میں ہماری فتوحات کا آغاز ان خیالات کے ماتحت نہیں ہوا بلکہ ایک حد تک فرانسیسیوں سے مقابلہ کرنے اور اپنی تجارتی کوٹھیوں کو ناگہانی حملوں سے محفوظ رکھنے کے خیال سے۔ کمپنی کے قوت اعلیٰ ہو جانے کے ایک عرصہ بعد تک ہم دیسیوں کی بہبودی سے غافل رہے۔

Adam Smith ششہ یعنی وارن ہسٹنگز کے آخری ہندو حکومت کے بیان میں لکھتا ہے ”ایسی کوئی حکومت نہیں ہو سکتی جو اپنی رعایا کی فلاح سے اس درجہ غافل ہو“ یہ قدرتی نتیجہ تھا اس ناقابل اعتقاد حالت کا جس میں محض گردشِ تقدیر سے ایک تجارتی کمپنی اچانک حکومت سے بدل گئی۔ یہ یہ سنا بظاہر اور اُس کے اثرات کمپنی کی حیات تک قائم رہے لیکن ششہ ۶ سے دور ہو گئے۔ کوئی بات اب ایسی نہیں باقی رہی جس سے خود غرضی کا شبہہ تک ہو سکے۔ اب ہماری حکومت سے زیادہ سہراں کوئی دوسری حکومت نہیں تھی اور جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اب ہم نے ہندوؤں کو اس اعلیٰ روشن خیالی سے جبکہ ہم مالک ہیں اس بنا پر محروم رکھنے کا خیال کہ انکو اُسکی ضرورت نہیں ہے، ترک کر دیا ہے۔

پھر اسی کے ساتھ تاریخی کے اجراء اور سفر کی سہولتوں نے۔ اول براہِ خشکی بعد ازاں براہِ نرسوز ہندوستان کو انگلینڈ سے بہت قریب کر دیا ہے۔ لوگوں کا اکثر اعتراض ہے کہ اس تبدیلی کا اثر مضر ہے اور ہر وقت ڈاؤننگ اسٹریٹ اور اس سے زیادہ انگریزی رائے عامہ کی مداخلت بہت زیادہ مضر ہے۔ بحث کی خاطر فرض کر لو کہ واقعی ایسا ہی ہے لیکن یہاں پر سوال یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کا انگلینڈ سے زیادہ متحد رہنا مناسب ہے یا نامناسب، حقیقت حال تو یہ ہے کہ چاہے اچھا ہو یا بُرا مگر ان دونوں ممالک کے تعلقات بجا نہ کم ہونے کے زیادہ ہوتے جا رہے ہیں

آؤ ایک بار پھر ہم اُس رفتار پر غور کریں جس سے ہمارا تعلق ہندوستان کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ مسٹر کنگم

Cunningham نے اپنی تصنیف ”برٹش انڈیا اور اسکے حکمران“ میں جو حال آج میں شائع ہو چکا ہے

۱۸۲۷ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان ہندوستان کی غیر ملکی تجارت کا برطانیہ کلان کی غیر ملکی تجارت سے مقابلہ کیا ہے یہ ترقی اکثر عظیم حیرت و استعجاب کا موجب ہوئی ہے۔ انگلینڈ کی غیر ملکی تجارت ۸۰ ملین سے ۶۵۰ ملین پونڈ ہو گئی۔ مسٹر کننگھم لکھتا ہے کہ اسی زمانہ میں ہندوستانی تجارت اس سے کہیں زیادہ ترقی کر گئی تھی اور چونکہ ہندوستان کی بیرونی تجارت خاص کر انگلینڈ کیساتھ ہے اسلئے نتیجہ یہ نکلا کہ ان دو ممالک میں تجارتی اتحاد کا میلان نہایت ہی قوی ہے اور اگر اب سے پچاس سال تک کوئی غیر متوقع حادثہ نہیں رونما ہوا تو یہ اتحاد حد درجہ استوار ہو جائیگا۔

اگر ان تمام واقعات کو جو میں نے بیان کئے ہیں یکجا جمع کر کے سلطنت ہند کا تصور کیا جائے تو عجیب نتیجہ نکلتا ہے اسکی مثال سلطنت رومہ کی ہے جس میں ہماری حیثیت حکمران کی تھیں ہے بلکہ معکم تہذیب و علوم کی بھی ہر جس طرح فاسٹ اور ہن کا اتحاد ایک عہد کا دوسرے عہد کیساتھ اتحاد تھا ٹھیک اسی عہد حاضر کا یورپ ایشیا کے قرن وسطی سے متحد ہو گیا ہے۔ سلطنت ہند ہمیشہ ہم سے الگ تھلگ رکھی جاتی ہے، اس سے ہین کوئی خراج نہیں ملتا، اس کا کوئی بار ہمارے اوپر نہیں پڑتا بجز اسکے کہ ہماری خارجی حکمت عملی البتہ متاثر ہوتی ہے۔ اسکی وجہ سے ہماری خانگی سیاست میں نہ تو کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے اور نہ کوئی قابل محسوس اثر پڑتا ہے۔ اس سلطنت پر ہمارا بیچہ آہنی مرور ایام کیساتھ بجائے سست ہونے کے زیادہ سخت ہوتا جاتا ہے ہندوستان اور انگلینڈ کا اتحاد اگرچہ غیر فطری اور نامبارک کیون نہ معلوم ہو لیکن عہد حاضر کے سیاسی اتحاد کے منافی نہیں ہے جو نہایت تیز رفتاری کیساتھ قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب واقعات تاریخ انگلینڈ میں سب سے زیادہ عجیب حیرتناک اور غالباً تمام ابواب سے زیادہ سبق آموز ہیں۔ بعض لوگوں کو اس پر فخر ہے کہ یہ کوئی طلسمی مہم تھی ممکن ہے جو محض عارضی ہو۔ لیکن جو لوگ تہ تک غور کر نیکیے ہو گئے ہیں وہ اس مہم کو کمال مایوسی کیساتھ دیکھتے ہیں لیکن چون چون زمانہ گزرنا جاتا ہے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم ایسی زبردست قدرت کے ہاتھ میں ہیں جو تمام تدبیر و سیاست پر بالاتر ہے۔ وہ ایشیئن جو کبھی بلا ارادہ ڈھیر ہو گئی تھیں قصر تہذیب کا ایک حصہ بننے والی ہیں اور ہندوستان جو انگلینڈ کی تمام کامیابیوں میں سب سے زیادہ عجیب تھا پایاں کار سب سے بڑی کامیابی ثابت ہو گا۔

اس مقام پر پھر ہماری نظر حال سے ہٹ کر باطنی کی طرف جاتی ہے اور ہمارے دلمیں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کن ربا کی بنا پر ہم نے اس مہم میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے کال ایک لکچر اس موضوع کی نذر کیا ہے کہ وہ کونسی طاقت تھی جسکی مدد سے ہم نے ہندوستان کے باشندوں کو اپنی حکومت کا مطیع کیا۔ لیکن موجودہ سوال اس سے مختلف ہے۔ وہ سوال تھا ”کس طرح؟“ اور یہ سوال ہے ”کیون؟“ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سلطنت بغیر کسی غیر معمولی طاقت و قابلیت کے قائم ہو گئی۔ لیکن سوال ہے آخر اسکے قیام کا محرک کیا تھا۔ اسکی تعمیر میں کتنی معزز، بہادر اور جفاکش ہستیاں قربان کرنا پڑیں؟ انھوں نے اپنی جانیں کیون قربان کیں؟ اگر انھوں نے خود بخود ایسا نہیں کیا بلکہ کسی حکم کی تعمیل میں تو وہ کون سی طاقت تھی جس نے انکو یہ حکم دیا۔ اگر یہ طاقت کمپنی تھی تو اسکو ہندوستان فتح کر کے کیا نفع ملتا۔ اور اگر یہ طاقت، حکومت انگلینڈ، تھی تو اسکی غرض

کیا تھی اور وہ کیونکر پارلیمنٹ کے روبرو اپنے اس فعل کو جائز ثابت کر سکتی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہم جنگ جو قوم رہے ہوں لیکن وہ خاص جنگیں جو ہم نے لڑیں زیادہ تر مدافعتانہ تھیں۔ فتح، غریبان نے کبھی اپنی طرف ہماری تو جسہ نہیں پہنچی۔ تو آخر ہمارے دل میں کیا تھا!

سلطنت انگلینڈ کو یقیناً اس تسخیر سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوا۔ کیونکہ اگر ایک طرف اسکے میزانیہ پر اس فتح کے اخراجات کا بار نہیں پڑا تو دوسری طرف کسی قسم کے خراج کی وجہ سے اسکے میزانیہ ہلکا بھی نہیں ہوا۔ اگر ہم سوال کریں کہ اس سے کس کو فائدہ ہوا تو اس کا صحیح جواب یہی ہوگا ”انگریزی تجارت کو“ اس ملک سے ہماری بیرونی تجارت بہت بڑے پیمانہ پر ہے اور جب تک ہم ہندوستان کے مالک ہیں یہ تجارت قائم رہے گی۔ اس معنی میں ہمارا ایک عظیم مادی فائدہ حاصل ہے جو اس زمانہ میں جب غیر ملکی حکومت مستحکم حفاظت کی محتاج ہے بسا غنیمت ہے۔ تو کیا یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ ابتدا سے آخر تک تجارت ہی ہمارا مطمح نظر تھا۔

یہ قول بظاہر معقول معلوم ہوتا ہے اور اس وقت تو اور بھی معقول معلوم ہوتا ہے جب ہم کہتے ہیں کہ ہماری سلطنت کی ابتدا تجارت سے ہوئی۔ پہلے پہل ہم نے صرف اپنی تجارتی کوٹھنوں کی حفاظت میں ہتھیار اٹھایا۔ جو صورت ہماری اور فرانس کی نوآبادیاتی جنگ کی تھی وہی صورت ہندوستانی لڑائیوں کی بھی تھی کیونکہ یہ بھی اسی زمانہ میں ہوئیں اور انکی نوعیت بھی وہی تھی۔ ان لڑائیوں کے اسباب وہی تھے جن پر میں نے بہت اصرار کیا ہے یعنی پندرھویں صدی میں جو جدید ممالک دریافت ہوئے انکی دولت کی خاطر مغربی سلطنتوں کی باہمی رقابت۔ امریکہ کی طرح ہندوستان میں بھی ہماری تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ دونوں ممالک میں ہمیں ایک ہی حریف یعنی فرانس سے مقابلہ پڑا۔ دونوں ممالک میں انگریز اور فرانسیسی سوداگر اپنے اپنے تجارتی مرکز سے ایک دوسرے کی مخالفت کر رہے تھے۔ امریکہ میں ہمارے پاس نیو انگلینڈ اور درجینا تھے تو انکے پاس اکاڈمی (Academy) اور کناڈا۔ ٹھیک اسی طرح ہندوستان میں مدراس، کلکتہ اور بمبئی ہمارے پاس تھے تو انکے مقابلہ میں پانڈیچری، چندر نگر اور ماہی فرانسیسون کے پاس۔

۱۷۶۳ء اور ۱۷۶۴ء کے مابین دونوں ملکوں میں ایک ہی ساتھ خطرہ رونما ہوا۔ اس وقت دونوں سلطنتوں کے درمیان جو ناقص اور سطحی معاہدہ تھا وہ ٹوٹ گیا تھا اور ایک سلطنت دوسری سلطنت پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔ لیکن دونوں جگہ انگریزوں کو فتح نصیب ہوئی۔ ہندوستان میں فرانسیسون پر غلبہ پاتے ہی ہم نے ہندوستان پر غلبہ حاصل کرنا شروع کیا۔ یہ واقعہ دوسرے واقعہ سے ملکر اس اصول کی طرف ہماری رہبری کرتا ہے کہ ہماری سلطنت کی ترقی میں شروع سے آخر تک جذبہ تجارت کا فرما رہا ہے۔ جب ہمارے اصلی مقامات میں استحکام حاصل ہو گیا اور دیسی طاقتوں اور فرانسیسون کی رقابت کی طرف سے اطمینان خاطر نصیب ہو گیا تو ہم نے اندرون ملک میں اپنی تجارت کو وسعت دینے کا منصوبہ باندھا۔ ہمارے یاست میسور اور مرہٹوں سے مقابلہ پڑا جو پہلے تو ہمارے ساتھ تجارت کرنے پر رضامند نہ تھے لیکن

تجارت کی حرص میں بہنے قوت کا استعمال کیا ان پر اپنی فوجوں سے یلغار کر دی، اُنکے کم گ قانون کو تباہ و برباد کر کے اُنکے علاقوں میں اپنا مال تجارت لیکر سیلاب کی طرح پھیل گئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہماری تجارت کو ترقی ہوتی گئی۔ پہلے تو یہ بالکل بے حقیقت بات تھی لیکن بعد میں اسکو بہت وسعت حاصل ہو گئی۔ انجام کار جب ہم نے تمام بڑی دیسی حکومتوں کا تختہ الٹ دیا۔ جب نہ کوئی مغل شہنشاہ رہ گیا نہ سلطان سیور، نہ مرہٹوں کا پیشوا باقی رہا نہ اودھ کے نواب اور نہ سکھوں کا مہاراجہ یا خالصہ، اسوقت تمام رکاوٹیں رفع ہو گئیں اور ہماری تجارت ناقابل قیاس پیمانہ پر پھولنے لگی۔

لیکن اگر بنظر تعمق غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ واقعات اس اصول پر صادق نہیں آتے۔ یہ سچ ہے کہ ہماری سلطنت کی ابتدا تجارت سے ہوئی اور یہ بھی صحیح ہے کہ تھوڑے دنوں سے اسکو بید فروغ ہے، لیکن تاریخ میں ضرور یہی نہیں ہے کہ واقعات کا سلسلہ ہمیشہ خط مستقیم کی طرح سیدھا چلا جائے حقیقت یہ ہے کہ اگر تجارت کی لہر ناقابل دفع ہوتی اور تمام مشکلات پر غالب آنے کیلئے ہر طرح تیار ہوتی تو اسکو ہندوستان میں جنگ کی نوبت نہیں آتی۔ کیونکہ وہاں پر حقیقی رکاوٹیں مفقود تھیں۔ انگریزی تجارت کو دیسی بادشاہوں کی رقابت کا خطرہ نہیں تھا بلکہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی کی رقابت کا اندیشہ تھا۔ لہذا تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ملکی فتوحات کی ترقی کو کوئی علاقہ نہیں۔

برخلاف اسکے ہماری تجارت باوصف تمام فتوحات کے ۱۸۳۷ء تک بالکل بے حقیقت تھی۔ ۱۸۳۷ء کے فوراً بعد ہی اس میں سرعت کیساتھ ترقی شروع ہوئی۔ یہ دونوں تاریخیں تجارت کی ترقی کے حقیقی اسباب کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارت کی ترقی فتوحات کی ترقی سے قطعی بے نیاز ہے۔ کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جب پالمنٹ کا وہ قانون نافذ ہوا جسکی بدولت کمپنی اپنی اجارہ داری سے محروم ہو گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ ہندوستان کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے فتح کیا تھا لیکن اُسکے ساتھ اعلیٰ پیمانہ پر تجارت اُس وقت وجود میں آئی جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا وجود معدوم ہو گیا۔ ہندوستان میں ہماری فتح ایک اجارہ دار کمپنی کی مرہون احسان ہے لیکن وہاں کی تجارت کو اسوقت فروغ حاصل ہوا جب خود کمپنی نیست و نابود ہو گئی۔

اس امر کو زیادہ واضح کرنے کے لئے آسان ہوگا اگر ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ کے ایسے عنوانات بیان کر دیں جن سے اسکی ترقی کے خاص مدایج ظاہر ہو جائیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۸۳۷ء میں یعنی ملکہ الزبتھ کے آخر عہد میں وجود میں آئی۔ جس نقطہ نظر سے ہم توسیع انگلستان کے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اس لحاظ سے عین وقت پر اس کمپنی کا وجود ہونا نہ قبل نہ بعد۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگلینڈ نے اپنی موجودہ بحری روش قریب قریب اسپینش آرماڈا کے وقت اختیار کی۔ اُسی وقت پہلے پہل اسکے بحری سوراؤن کی قوم بنو دار ہوئی اور اُسی وقت اسنے امریکہ میں نوآبادی قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہکو ہندوستان میں اپنے ابتدائی قیام کے لئے اُسی زمانہ کی طرف نظر کرنا چاہئے۔ واقعی ٹھیک اُسی وقت ہندوستان میں ہمارے قیام کی ابتدا ہوئی کیونکہ اسپین کے بحری بیڑہ (Armada) کی شکست نے ۱۵۸۸ء سال بعد

ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی

یہ کمپنی محض تجارت کی غرض سے قائم ہوئی اور ایک سو اڑتالیس سال تک صرف تجارت پر اسکی توجہ مرکوز رہی۔ اس زمانہ میں اسکی تاریخ میں کئی اہم واقعات ہوئے لیکن ان میں کوئی اتنا اہم نہیں جو ہماری توجہ کا مستحق ہو۔ ۱۷۰۷ء میں دکن میں بڑے پیمانہ پر فسادات رونما ہوئے جنہوں نے کمپنی کو مجبور کیا کہ وہ بھی اعلیٰ پیمانہ پر حکومت اور جنگ کی خدمت میں انجام دے۔ اسکے بعد کمپنی کا دوسرا قابل یاد کار دور شروع ہوا جو مدت میں دو راہوں کے برابر تھا۔ یہ دور ۱۱ سال کی مدت پر حاوی ہے اور ۱۷۵۷ء میں کمپنی کی تاریخ پر ختم ہوا۔ یہی وہ دوسرا دور ہے جس سے ہم کو اس وقت بحث ہے ارتقاء کے مختلف مدارج سمجھنے کے لئے ہم اس دور کو کئی حصوں میں تقسیم کریں گے

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس دور کے بیشتر واقعات میں ایسا تسلسل ہے جو تاریخ میں بہت کم پایا جاتا ہے اور اس سے یادداشت میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کمپنی اپنے عہد نامہ کی تجدید کے لئے پارلیمنٹ کی محتاج تھی۔ چونکہ ۱۷۰۷ء سے کمپنی کے حالات نے عجیب روش اختیار کر لی تھی اسلئے پارلیمنٹ کے لئے بالکل قدرتی تھا کہ وہ عہد نامہ کی تجدید ایک مدت معینہ کے لئے کرے اور پھر اسکے اختتام پر کمپنی کے حالات پر غور کر کے اسکے انتظام میں ضروری تبدیلیاں پیدا کرے اس طرح کمپنی میں تھوڑے تھوڑے مساوی المدت وقفہ کے بعد تبدیلیاں ہونے لگیں۔ ہر وقفہ کی مدت ۲ سال ہوتی تھی۔ اسکا آغاز ۱۷۰۷ء میں لارڈ نارٹھ کلف کے ریگولٹنگ ایکٹ سے ہوا۔ اسکے بعد چار تاریخیں ایسی ہیں جو کمپنی کی تاریخ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں یعنی ۱۷۹۳ء، ۱۸۱۳ء، ۱۸۳۳ء، ۱۸۵۳ء

یہ تاریخیں ہماری توقع کے مطابق اہم ہیں اور کمپنی کی تاریخ کے لئے ان سے زیادہ سہل ڈھانچہ ہونا مشکل ہے پہلی تاریخ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر ۱۷۰۷ء میں اس تحریک کی بنا پڑی جو آگے چلکر برٹش انڈیا کے وجود کا باعث ہوئی تو ۱۷۰۷ء اس زمانہ کی یاد تازہ کرتا ہے جب خود برٹش انڈیا عالم ہستی میں آگئی۔ اسی سال سے گورنر جنرل کا سلسلہ شروع ہوا۔ اگرچہ ایک عرصہ تک یہ عہد بجائے گورنر جنرل ہندوستان کے گورنر جنرل بنگال کہلاتا تھا۔ اسی زمانہ میں کلکتہ میں عدالت العالمیہ قائم ہوئی۔ اسی وقت ہمارے ہندوستانی معاملات کو بے انتہا خطرون کا سامنا پڑا اور کمپنی میں جو بدعنوانیاں تھیں انکا سدباب بھی اسی وقت ہوا کیونکہ کمپنی کے حصہ داران یا مالکان کو اسکے معاملات میں اب کوئی اختیار باقی نہیں رہ گیا تھا۔

دوسرے دور کی تاریخ ۱۷۹۳ء ہے۔ یہ تجدید کم اہم ہے البتہ اس وقت جو کشین ہوئے وہ ضرور دلچسپ تھیں کیونکہ انہیں اینگلو انڈین طبقہ کی ابتدائی زندگی کا وہ نقشہ نظر آتا ہے جب اس میں ہندو مت سرایت کر گئی تھی، جب ہندوستان کو جنت کی طرح پاک رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی اور کسی یورپین خصوصاً مشنری والوں کو اسکے اندر گھسنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن ۱۷۹۳ء کی تاریخ بنفسہ اتنی ہی اہم ہے جتنی اور تاریخیں کیونکہ

اس سسٹم میں کمپنی کے عہد نامہ کی تجدید ہی نہیں ہوئی بلکہ اسی سال بنگال کا مشہور ہندو بست و دائمی بھی ہوا جو دنیا کی تاریخ میں نہایت قابل یادگار واقعہ ہے

دوسری تاریخ تجدید سسٹم ۱۸۳۳ء ہے جب انٹی سال کا بڑھانا توان دارن ہندوستان سے نیشن لیکر دارالعلوم میں شہادت کے لئے طلب ہوا۔ یہ تاریخ اس زمانہ کو بتلاتی ہے جب کمپنی کی اجارہ داری میں انحطاط شروع ہوا اور برہمنیت کا دور آخر ہوا۔ جب انگلینڈ نے اپنی تہذیب یا بالفاظ دیگر عیسائیت اور مغربی علوم کی تبلیغ ہندوستان میں شروع کی

۱۸۳۳ء میں اجارہ داری ختم ہو گئی۔ اس وقت عملاً کمپنی کا وجود باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد کمپنی کی حیثیت محض ایک کارآمد ادارہ سے زیادہ نہیں رہی، کارآمد اس لئے کہ اسی کی روایات اور تجربات پر ہندوستان پر انگلینڈ حکومت کرتا تھا۔ اس وقت سے ہماری ہندوستانی گورنمنٹ باضابطہ طریقہ پر وضع قوانین کی زحمت برداشت کرنے لگی

پھر ۱۸۵۳ء میں مقابلہ کے ذریعہ تقرری کا قاعدہ نافذ ہوا۔ اس طرح وہ پرانا مسئلہ جس نے ۱۸۳۳ء میں انگلینڈ کی بنیاد متزلزل کر دی تھی اور جس کو بڑے سے بڑا مدبر بھی چھوٹے ہوئے سہمتا تھا حل ہو گیا۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان کی سیادت کس کو ملنی چاہئے اور کیونکر بغیر انگلینڈ کے دستور اساسی پر دباؤ ڈالے ہوئے اس مسئلہ کی گتھی سلجھائی جاسکتی ہے۔

لیکن اس جگہ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کی یہ رفتار یکساں عرصہ تک قائم نہیں رہتی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے اس دور تجدید پر آخری مہر لگا دی۔ اور ۱۸۵۷ء جو ریگولٹنگ ایکٹ کی صد سالہ سالگرہ ہے ہندوستان کی تاریخ میں کوئی اہم تاریخ نہیں ہے۔

اس خاکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۳۳ء وہ سسٹم ہے جس میں اجارہ داری میں بہت کمی واقع ہوئی اور ۱۸۳۳ء وہ سال ہے جس میں قطعی طور سے اسکو تباہ کر دیا گیا۔ چنانچہ ۱۸۳۳ء ہندوستان کے ساتھ ہماری تجارت کو اس قدر بے حقیقت لکھتا ہے اپنے سامنے صرف ۱۸۳۳ء تک کے اعداد و شمار رکھتا ہے۔ وہ اعداد و شمار جن سے موجودہ تجارت کی ترقی کا اندازہ لگتا ہے ۱۸۳۳ء کے زمانہ مابعد سے متعلق ہیں، خصوصاً ۱۸۳۳ء کے مابعد زمانہ سے۔ دوسرے لفظوں میں جب تک ہندوستان اُن لوگوں کے قبضہ میں رہا جن کا مسلح نظر تجارت تھا، اسکی تجارت بالکل حقیر تھی جب سے ہندوستان پر ہندوستان کی خاطر حکومت ہونے لگی اور تجارتی اغراض سے بے اعتنائی برتی جانے لگی تو پھر اسکی تجارت کو فروغ ہوا، اور بے حساب فروغ۔ بظاہر یہ حقیقت غلط معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کیا ہمیں یاد نہیں ہے کہ تجارت سے بے اعتنا ہو کر ہم نے اجارہ داری تباہ کر دی۔ لیکن اگر ایک تجارتی کمپنی باوجودیکہ اسکی غرض و غایت تجارت ہی ہو اپنے مدعا میں ناکام رہے اور اجارہ داری کی قیود کے دور ہوتے ہی اسکی تجارت اعلیٰ پیمانہ پر پونچ جائے تو اس میں کوئی

تعجب کی بات نہیں۔

کیا ہم نہیں دیکھتے کہ ہمارا تجارتی فروغ قطعی اس زمانہ سے متعلق نہیں ہے جب ہندوستان میں ہمارے قبضہ کی ابتدا ہوئی۔

ہندوستان میں چار بڑے حکمران گذرے ہیں جنکو جرمنی کی اصطلاح میں ”سلطنت کا ترقی دینے والا“ کہا جاسکتا ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔ لارڈ کلايو۔ یانی سلطنت، لارڈ ویلیزلی۔ لارڈ ہسٹنگز۔ اور لارڈ ڈلہوزی پہلے نے ہکو کلکتہ سے لیکر مدراس تک مشرقی ساحل پر تصرف کر دیا، دوسرے اور تیسرے نے مرہٹوں کی قوت توڑ کر ہکو وسط ہند اور جزیرہ نما کے مغربی حصہ پر تسلط کر دیا اور چوتھے نے ان فتوحات کو مستحکم کرنے کے علاوہ ہمارے قبضہ میں شمالی مغربی حصہ دیکر ہماری سرحد کو انڈس تک پہنچا دیا۔ ان فتوحات کے درمیان طویل وقفہ ہوا۔ چنانچہ یہ فتوحات کئی الگ الگ مجموعوں میں پڑتی ہیں۔ ایک زمانہ فتوحات کا ششہ ۱۷۵۷ء اور ۱۷۶۱ء کے درمیان تھا۔ اسکو ہم لارڈ کلايو کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ دوسرا دور ۱۷۶۱ء سے شروع ہوا اور تقریباً ۱۷۸۲ء تک رہا، اگرچہ اس زمانہ کا بیشتر حصہ خالی گذرا۔ اس دور کو ویلیزلی اور ہسٹنگز کے نام سے معنون کر سکتے ہیں۔ تیسرا دور جنگ کا تھا اور یہ ۱۷۸۲ء اور ۱۷۸۵ء کے درمیان رہا۔ لیکن اس کا ابتدائی حصہ ناموافق گذرا البتہ دوسرے حصہ میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن ان فتوحات کا ثمرہ لارڈ ڈلہوزی کی قسمت میں لکھا تھا

اب ان مملکتی اور تجارتی ترقیوں میں قطعی مطابقت زمانہ نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ ابھی ہم نے لکھا ہے کہ ۱۷۸۲ء تک ہندوستان کی تجارت کس قدر غیر اہم تھی حالانکہ یہ زمانہ ٹھیک ویلیزلی کے احاطہ عظیم کے بعد کا ہے برخلاف اسکے ۱۷۸۲ء میں تجارت کو نہ معلوم کہاں کے پرنگ گئے حالانکہ تاریخ میں یہ زمانہ نہایت پر امن شمار کیا جاتا ہے۔ عذر کے قریب احاطہ کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اسکے بعد سے چوتھائی صدی کا زمانہ گذرا اس درمیان میں کوئی فتوحات نہیں ہوئیں لیکن یہ زمانہ تجارت کی انتہائی تیز رفتاری کا زمانہ تھا۔

چنانچہ جس طرح یہ دعویٰ باطل ثابت ہوتا ہے کہ یہ سلطنت فوجی پیش قدمی کے ناما بہت اندیشانہ جوش کا نتیجہ ہے اسی طرح یہ خیال بھی باطل ہے کہ یہ تجارت کے مجنونانہ انہماک کی منت پذیر ہے۔

قیام سلطنت کی جانب ہمارا پہلا قدم اپنی کوٹھیوں کی حفاظت میں اٹھا۔ احاطہ مدراس ہماری اسی کوشش کا نتیجہ ہے جو پہنے قلعہ سنیت جارج اور سنیت ڈیوڈ کی مدافعت میں کی تھی۔ اسی طرح احاطہ بنگال فورٹ ولیم کی محافظت کے سلسلہ میں ہاتھ آیا جب پہنے بنگال کے سلطان نواب سراج الدولہ کو کال کوٹھری کے مظالم کی سزا دی تھی۔

یہاں تک اسباب واضح ہیں۔ اسکے بعد جو زمانہ آیا یعنی برطانوی ہند کا وہ انقلابی دور جس میں رشوت ستانی اور بے ایمانی کی گرم بازاری تھی، سلسلہ طور سے سخت گیری کا دور تھا۔ وارن ہسٹنگز کے خلاف جو اس قدر تشدد کا روایا

بنارس، اودھ اور روہیلکھنڈ میں ہوئیں وہ سب رشوت ستانی کے سلسلہ میں تھیں۔ اگر برطانوی ہند کی مابعد کی تاریخ بھی اسی قسم کی ہوتی تو ہم بلاخوف کہہ سکتے تھے کہ یہ سلطنت بھی سپے نیولا اور پیرو کی ہسپانوی سلطنت کی طرح جلب منفعت کے مجنونانہ جوش کی بدولت قائم ہوئی ہے

لیکن کارڈ کارنوالس کے عہد سے (۱۸۵۷ء) اس روش میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ کچھ تو اپنے اعلیٰ کیریئر کے نمونہ اور کچھ دانشمندانہ اصلاح سے اُسے ملازمت کو بے ایمانی سے کلیتہً پاک کر دیا۔ اُس نے کمپنی کے ملازمین کی تنخواہیں اتنی معقول کر دیں کہ انھیں رشوت ستانی کا کوئی حیلہ باقی نہیں رہا۔ اس وقت سے ملازمت معزز شمار ہونے لگی۔ اس تبدیلی سے قدرتی طور پر ہمو توقع ہونی چاہئے تھی کہ اگر طمع زرہی فتوحات کی محرک تھی، تو کمپنی کی زیادتیوں موقوف ہو جائیگی۔ کیونکہ اس وقت سے نہ صرف کمپنی کے ایجنٹ اپنے کیریئر کو کھونے لگے بلکہ اُن کے لئے صریح دغا بازی اور بے ایمانی کیساتھ فتوحات حاصل کرنا قطعی ناممکن ہو گیا۔ اس لئے کہ ۱۸۵۷ء سے جب *Public* نے حکمت دو عملی جاری کی ایسا کرنا اُسی وقت ممکن تھا جب انگریزی وزارت شکوہ کمپنی اپنا شریک بنا لیتی حالانکہ انگریزی وزارت سے بلند حوصلگی کا جرم، سرزد ہونا تو ممکن تھا لیکن اس کی ذات سے یہ امید رکھنا کہ وہ ایک تجارتی کمپنی کے کمینہ جرائم سے اغماض کرے گی قطعی ناممکن تھا

حقیقت یہ ہے کہ *Public* کے انڈیا بل کے زمانہ سے ہندوستانی معاملات کا اعلیٰ انتظام کمپنی کے ہاتھ سے نکل گیا اُس وقت سے وہ ہم جو تجارتی اغراض کے ماتحت شروع ہوئی تھی ایسے لوگوں کے انتظام میں آگئی جنکو تجارت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اُس وقت سے ہندوستان کے خاص خاص مسائل کا انصرام دو انگریز مدبروں کے ہاتھ میں آ گیا ایک صدر بورڈ آف کنٹرول اور دوسرے گورنر جنرل۔ اور جب تک کمپنی کا قیام رہا ان دونوں میں ممتاز حیثیت گورنر جنرل ہی کی تھی۔ اس انتظام کے ماتحت ہندوستان کی بیشتر فتوحات حاصل ہوئیں اور یہ یقینی ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے ہندوستانی معاملات میں تجارت کی روح کا رفرمانہ نہیں تھی

۱۸۵۸ء سے جب لارڈ کارنوالس گورنر جنرل ہوا ہندوستان کی حکمت عملی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس نے پہلے پہل مداخلت اور احاق، کا اصول مرتب کیا۔ اس اصول سے لارڈ ہسٹنگز نے گورنر جنرل ہونے سے قبل تو اختلاف کیا تھا لیکن بعد کو اسی پر عمل کیا۔ سب سے آخر میں اس اصول پر لارڈ ڈلہوزی نے نہایت سختی سے عمل کیا۔ لارڈ ڈلہوزی کمپنی کا سب سے آخری گورنر جنرل تھا

یہ تھا وہ اصول جس کے ماتحت ہندوستان فتح ہوا۔ اس لکچر میں آئی گنجائش نہیں ہے کہ میں اس اصول کا تجزیہ کروں۔ میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ یہ تجارت کی ترقی کا حامی نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ کمپنی نے ہمیشہ اس کی حمایت سے اختلاف کیا۔ کمپنی نے ویلنزی کی مخالفت اور ہسٹنگز کو ملازمت کی، اگر ڈائرکٹر ان کمپنی لارڈ ہسٹنگز کے

ساتھ بہت ملائمت سے پیش آتے تھے تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس زمانہ میں انکی حیثیت عملاً ایک تجارتی کمپنی کے نمائندہ کی نہیں رہ گئی تھی۔ بعض اوقات اس اصول پر نہایت سختی سے عمل کیا گیا خاص کر لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں۔ لارڈ ڈلہوزی فریڈرک اعظم کے نمونہ کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے اُسکے افعال کو حق بجانب کہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا تسخیر ملیشیا یا تقسیم پولینڈ کو۔ لیکن اگر یہ افعال جرم ہیں تو اسی قسم کے جیسے کہ فریڈرک اعظم کے۔ یعنی یہ جرم عالی حوصلگی کے تھے نہیں خود غرضی کا مطلق شائبہ نہیں تھا۔ نہ تو لارڈ ڈلہوزی اور نہ دارن ہسٹنگز کے بعد کوئی دوسرا گورنر جنرل کمینہ سخت گیری کا مجرم قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہماری سلطنت جسکی ابتدا اور اصل تجارت سے ہوئی نہ تو تاجرون کے دماغ کی پیداوار ہے اور نہ تجارتی اغراض کے ماتحت وجود میں آئی اگرچہ اس وقت ہماری تجارت بڑے پیمانہ پر پہونچ گئی ہے۔

عبد القیوم رسا

ضرورت ہے

ایک سند یافتہ آیور ویدک ڈاکٹر اور ایک حکیم کی ناگپور کے آیور ویدک دیونانی شفا خانہ کیلئے کسی سرکاری مستند کالج کے سند یافتہ اور تجربہ کار کو ترجیح دیجائے گی ماہانہ مشاہرہ ۱۵۰ روپے سے شروع ہو کر دو روپیہ سالانہ کی ترقی سے لغہ تک ہو گا پیر الویٹ پر مکیٹس کی بھی اجازت ہوگی لیکن اُن شرائط کے ساتھ جو ملازم گورنمنٹ سب اسسٹنٹ سرجن پر عاید ہوتی ہیں۔ درخواست کے ساتھ نقول سناد بھی ہونا چاہئے اور اس امر کی صراحت کہ کن تعلیم کا ہون میں در کس کس فن (سجکٹ) میں تعلیم حاصل کی ہے۔ عمر کا بھی اظہار ہونا چاہئے اور چارچلن کے خوبی کی تصدیق بھی۔ درخواستیں حسب ذیل پتہ سے ۲۸ مارچ ۱۹۳۷ء تک جانا چاہئے۔

اس۔ پی۔، چوبے

میونسپل کمیٹی ناگپور

باب الاستفسار

غالب و بیدل

(جناب سید زوار حسین صاحب گویا)

اس سے قبل آپ کی بعض تحریروں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ غالب کو بیدل کا متبع سمجھتے ہیں حالانکہ دونوں کے رنگ کلام میں بہت فرق ہے۔ کیا آپ اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے،

(نگار) جہاں تک میرا حافظہ یاوری کرتا ہے، مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے غالب کو بیدل کا مقلد یا متبع لکھا ہو، لیکن یہ ضرور میں نے کسی جگہ ظاہر کیا ہے کہ اول اول غالب نے ریختہ میں بیدل ہی کے تتبع کی کوشش کی، لیکن جیسا کہ میں کا میابی نہ ہوئی تو مومن کا رنگ اختیار کر کے بعض خصوصیات کے لحاظ سے ایک مستقل رنگ کا مالک ہو گیا۔

میں غالب کو بیدل کا متبع یا مقلد اس وقت کہتا جب وہ اس رنگ میں کامیاب ہو جاتا۔ ناکامی کی حالت میں کیونکر ایسا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان، یہ ضرور کہوں گا کہ اس نے اس کی کوشش ضرور کی اور آخر کار منزل کی دشواریوں کو دیکھ کر اپنا جاوہ مقصود ہی بدل دیا۔

اس سلسلہ بحث میں صرف دو سوال پیدا ہوتے ہیں:-

(۱) کیا غالب نے بیدل کا تتبع کیا اور کیوں؟ (۲) کیا اس سعی میں وہ ناکام رہا اور کن اسباب کی بنا پر۔

پہلے سوال کا اول جزو اپنے ثبوت کے لئے زیادہ کاوش کا محتاج نہیں خود غالب کا بیان کافی ہے ملاحظہ ہو:-

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خان قیامت ہے

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

مغرب دل نے مرے تار نفس سے غالب ساز پر رشتہ پئے نغمہ بیدل بانڈھا
دوسرے شعر میں غالب علانیہ اعتراف کرتا ہے کہ مجھے بیدل کی جدت طرازیان پسند ہیں جسے وہ بیدل کے مخصوص انداز میں رنگ بہار ایجادی سے تعبیر کرتا ہے، تیسرے شعر میں وہ زیادہ قوت کے ساتھ ظاہر کرتا ہے کہ میرا تار نفس

نغمہ بیدل کے لئے وقف ہے۔ پہلا شعر معلوم ہوتا ہے بہت بعد کا ہے جب خود اس نے محسوس کر لیا کہ بیدل کا تتبع ممکن نہیں اسی کے ساتھ جب اس کی شاعری کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو کثرت سے اس کی شہادتیں ملتی ہیں کہ غالب نے ریختہ میں کہاں کہاں اور کس کس طرح ”بیدل سرائی“ کی ہے۔ نسخہ حمید یہ کے دیکھنے سے تو ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ غالب کے حذف شدہ کلام میں عنصر غالب اس حصہ کا ہے جس میں بیدل کا رنگ پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے لیکن سب سے معروف و متداول دیوان میں بھی بہت سے اشعار اور متعدد ترکیبیں اس ثبوت میں پیش ہو سکتی ہیں۔

نسخہ حمید یہ کے حسب ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:-

فضائے خندہ گل تنگ و ذوق عیش ہے پروا فراغت گاہ آغوش و داغ دل پسند آیا
ہوئی جس کو بہار فرصت ہستی سے آگاہی برنگ لالہ جام بادہ بر محل پسند آیا
سواد چشم بسمل انتخاب نقطہ آرائی خرام ناز ہے پروائی قاتل پسند آیا
یہ ساری غزل غالب نے قصداً بیدل کے رنگ میں لکھی تھی جس کا اعتراف وہ خود مقطع میں کرتا ہے:-
اسد ہر جاسخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے مجھے رنگ بہار ایجاد دی بیدل پسند آیا

نہ بھولا اضطراب دم شمار ہی نظر اپنا کہ آخر شیشہ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

جاندا دگان کا حوصلہ فرصت گزار ہے یا نعرہ پییدن بسمل نہیں رہا

ہوں قطرہ زن بوادی حسرت شبانہ روز جز تار اشک جادہ منزل نہیں رہا

شوق سامان فضولی ہے وگرنہ غالب ہم میں سرمایہ ایجاد تمنا کب تھا

موقوف کیجئے یہ تکلف نگار یاں ہوتا ہے ورنہ شعلہ رنگ حنا بلند

غرور ضبط وقت نزع لوطا بقرار نہ نیاز بال افشانی ہوا صبر و شکیب آخر

پیما نہ وسعت کدہ شوق ہوں لے شک محفل سے مگر شمع کو دل تنگ نکالوں

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج مین عندلیب گلشن نا آ فریدہ ہوں
 الغرض اس قسم کے اشعار کثرت سے نسخہ حمید یہ مین پائے جاتے ہیں جو بیدل کے تتبع مین لکھے گئے ہیں۔ معروف
 دیوان کے بھی بہت سے اشعار اسی رنگ کے ہیں۔ جن سے ہر شخص واقف ہے تحریر و انتخاب کی ضرورت نہیں۔
 اب سوال یہ ہے کہ کیوں غالب نے بیدل کا تتبع کیا اور کیوں اس مین وہ ناکام رہا۔ اور اس کے ساتھ یہ امر بھی
 قابل غور ہے کہ فارسی مین کیوں اس نے بیدل کا رنگ اختیار نہیں کیا جس مین اس کے لئے زیادہ آسانی تھی۔
 اس مین شک نہیں کہ غالب فطرت کی طرف سے فارسی کا نہایت پاکیزہ ذوق لیکر آیا تھا اور اسی کے ساتھ
 خوش نختی سے اُسے استاد بھی ایک ایرانی ماہر زبان مل گیا اس لئے ظاہر ہے کہ اس نے پہلے فارسی ہی زبان کی شاعری کی
 طرف توجہ کی ہوگی اور اساتذہ ایران ہی کے کلام کو اپنے سامنے رکھا ہوگا۔ پھر چونکہ ذوق مین شروع سے شوخی پائی جاتی تھی اور
 عنقوان شباب مین رندانہ جوش و خروش کا ہونا فطری امر ہے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ ابتداء اُسے بیدل کی طرف توجہ ہوئی
 جو نہ ایرانی شاعر تھا اور نہ اُس سطح کا جو عام طور پر غزلگوئی کے لئے مخصوص ہے۔ بعد کو جب غالب سن و قوت کو پہونچا اور
 زمانہ کے گرم و سرد تجربات نے اُسے روحانیت کی طرف مائل کیا تو یہ وہ وقت تھا جب اسکی رخیختہ گوئی شروع ہو گئی تھی
 حالت یہ تھی کہ مغلیہ عہد کا چراغ بجھ رہا تھا، مصائب و آلام نے دلون مین سوز و گداز پیدا کر رکھا تھا اور طیائع تشام
 شاعری کی جانب مائل تھے۔ غالب، ہر چند ایسی طبیعت لیکر نہ آیا تھا کہ اس ماحول سے صحیح معنی مین جذبات استسلام
 اس کے اندر پیدا ہوتے، لیکن کچھ نہ کچھ اثر اُسپر بھی ہوا اور دل مین ہلکی سی وہ کیفیت پیدا ہوئی جس کا پایا جانا کلام
 بیدل سے لطف اٹھانے کے لئے ناگزیر ہے۔ رخیختہ گوئی کا زور تھا، غالب بھی محافل مشاعرہ کی گرم بازاری مین حصہ
 لے رہا تھا۔ اپنے فارسی کلام سے اپنی رخیختہ گوئی کو ممیز بنانا چاہتا تھا، بلندی ذوق جدت طرازی، میر و درد کے رنگ
 کی طرف مائل نہ ہونے دیتی تھی اس لئے وہ مجبور ہو گیا کہ بیدل ہی کو سامنے رکھ کر رخیختہ گوئی کے نقوش ساز کرے کیونکہ وہ
 اس رنگ مین فارسی ترکیبیں بھی اغلاق پسندی کی حد تک استعمال کر سکتا تھا جو اس کا طبعی رجحان تھا اور اپنی تخیل مین
 بھی ندرت و ابداع کی صورت مین پیدا کر سکتا تھا جو اس کا ذہنی میلان تھا۔

پھر اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ غالب کی ناکامی کے اسباب کیا تھے۔ اسپر غور کرنے سے قبل ضروری ہے کہ
 کلام بیدل کی خصوصیات کو مختصراً ظاہر کر دیا جائے

اکثر تذکرہ نویسوں نے جن مین مولانا شبلی مرحوم بھی شامل ہیں، بیدل کے سمجھنے مین سخت غلطی کی ہے اور اسلئے
 اُس کے کلام پر وہ صحیح تنقید نہ کر سکے۔ اسپر سب سے بڑا الزام یہ رکھا گیا ہے کہ اس کے کلام مین فارسیت نہ تھی اور دور
 از کار استعارات و تشبیہات نے اس کے کلام کے اغلاق کو اہمال کی حد تک پہونچا دیا تھا۔ پہلا الزام اگر وہ واقعی
 بیدل کے لئے کوئی الزام ہو سکتا ہے، یقیناً ایک حد تک صحیح ہے، کیونکہ محض لطف زبان نہ اس کا مقصود تھا اور نہ

زبان کی پابندی کے ساتھ وہ اپنے خیالات کو ادا کر سکتا تھا، وہ اپنے جذبات کو ظاہر کرنا چاہتا تھا اور جب زبان کی تمام معمولی و متداول ترکیبیں ناکافی ثابت ہوتی تھیں تو بالکل الہامی و وجدانی طور پر از خود نئی نئی ترکیبیں اس کے ذہن سے پیدا ہوتی تھیں اور اس طرح گویا وہ اپنی قدرت تخیل کے ساتھ ساتھ ایک نئی زبان بھی پیدا کر رہا تھا، بیدل کو محض شاعر کہنا اور شاعر سمجھ کر اس کے کلام پر تنقید کرنا درست نہیں، وہ شاعر سے زیادہ بلند چیز خندید تھا بلکہ اس سے بھی ارفع ایک خلاق سخن تھا، ایک پیام رسان قدرت تھا، حسن و عشق کی معمولی شاعری اس کے ذوق سے بہت فروتر چیز تھی اور اس کا ہر لفظ ایک ایسا نغمہ لاہوتی تھا جس کی مثال سوائے الہامی کتابوں کے کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ پھر ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو صرف سعدی، نظامی، حافظ، فردوسی، عرانی، نصیری، کی سطح سے بیدل کا مطالعہ کریں گے وہ یقیناً کوئی لطف اس کے کلام میں نہ پائیں گے اور جنہوں نے وہ مخصوص ذہنیت فطرت کی طرف سے نہیں پائی ہے، جو بیدل کے حقائق و معارف کو سمجھ سکے، وہ اگر اس کے کلام کو مغلق مہمل اور لغو نہ قرار دیں تو تعجب ہے

بیدل اپنے بعد لاکھوں شعرا اور سیکڑوں صفحات نشر کے چھوڑ گیا، لیکن آپ باوجود سعی و کاوش اس کا ایک مصرعہ یا ایک فقرہ بھی ایسا نہیں دکھا سکتے جو اس کے حقیقی رنگ، اس کے صمیمی پیام سے علیحدہ ہو، اس کی شاعری، اس کی انشا، یکسر وقف تھی صرف اس ایک جذبہ کے اظہار کے لئے کفایت و مخلوق کا تعلق نہایت و لا نہایت کا سا تعلق ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ جو حقیقتاً صرف ایک پر تو ہے اسی ایک آفتاب کبریائی کا، اپنے جزا اصلی، اپنے منبع فطری تک پہنچنے کے لئے بیتاب ہے اور یہ تمام جستجو صرف ایک حیرت ہے غیر متناہی، ایک حیرانی ہے ابدی، اور ایک بیکسی و بیچارگی ہے ناقابل علاج

کلیات بیدل کے تمام مجموعہ میں صرف رقعات ہی کا ایک حصہ ایسا ہو سکتا تھا جس میں اس امر کا امکان تھا کہ وہ اپنی نگاہ کو بلندی سے ہٹا کر پستی کی طرف مایل کرتا، لیکن اس پر اتنا زبردست رنگ چڑھا ہوا تھا کہ دنیاوی معاملات و تعلقات کے اظہار میں بھی وہ اپنے حقیقی رنگ طبیعت کو نہیں چھوڑتا اور مادی تعلقات کی دنیا کو بھی وہ بالکل آسمانی و اشیری (بلکہ منصفانہ) صورت سے پیش کرتا ہے

وہ ایک شخص کو خط لکھتا ہے اور اس کی تعبیر ان الفاظ میں کرتا ہے:-

شاد باش اے دل کہ آخر عقدہ ات وامی شود قطرہ مامی رسد جائے کہ دریامی شود

کسی دوست کی پریشانی پر وہ اس رنگ میں اظہار خیال کرتا ہے:-

مشت خالم عشق نبادانستہ صیدم کردہ است اے حیا آہم مکن از رنگ صیادم میرس

ایک جگہ نہ پہنچ سکے کا عذریوں ہوتا ہے:-

نگہ گر نشد قابل روئے دوست فغان می رسام بجائے کہ دوست
ایک صاحب نے ایک دلق تحفہ پیش کی تھی، اس کا شکر یہ ان الفاظ میں ہوتا ہے:-
سزد کہ چشم ہوس از گل و سمن پوشیم سرے کشیم درین گو دری (گدڑی) چمن پوشیم
ہوس دے کہ تمنائے این لباس کند ہزار جان ہم آریم تا بدن پوشیم
اگر باین ہنرست آپ و رنگ عریانی چه لازم ست کہ ما عیب پیرہن پوشیم
دران بساط کہ وارستگی ست خلعت ناز مرقع سحر از بوئے یاسمن پوشیم
کسی صحبت گزشتہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

ماہم از گلشن دیدار گلے می چیدم ہر کجا آئینہ بینید مرا یاد کنید
یہ ہے رنگ بیدل کا رقصات و مکاتیب میں۔ اور اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نکات، چہار عناصر اور
مثنویوں میں اُس نے کیا کچھ نہ لکھا ہوگا اور بلندی خیال، رفعت تصور، جدت بیان، اور ندرت ادا کے کیسے کیسے
نادر نقوش ان میں پائے جاتے ہونگے۔ چونکہ اس مضمون میں بیدل پر تنقید کرنا مقصود نہیں ہے اس لئے میں زیادہ
مثالیں دینے سے معذور ہوں، لیکن مذکورہ بالا چند اشعار سے بھی کافی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیدل پر کس قدر گہرا
اثر پیغام حقیقت کا تھا اور اس کی زبان کا ہر لفظ اسی کے لئے وقف تھا

غالب کو اپنی ذہانت، فارسیت اور شاعری پر جتنا ناز تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، مشکل ہی سے وہ کسی
کا قابل ہوتا تھا، لیکن بیدل کی جدت طرازیوں اور معنی آفرینیوں سے وہ بھی مرعوب ہو گیا اور اس حد تک کہ آخر کار
اس نے اس کے تتبع کی کوشش شروع کر دی اور پھر خود ہی اس کے ذوق سلیم نے بتا دیا کہ کامیابی ممکن نہیں۔ غالب کی
ناکامی کا سبب صرف یہ ہوا کہ اس نے زمین وہ نہیں پیدا کی جو بیدل کی تخیل کو بار آور کر سکتی۔ بیدل نے صرف فلسفہ تکوین
کو سلنے رکھا اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ خالق و مخلوق کا تعلق، قدرت کی بے پایان وسعت، اس کے مظاہر
و آثار، اپنی محدود و ناکام جستجو اور آخر میں وحدت وجود جو نتیجہ ہے اس نوع کی سعی و جستجو کا۔ غالب نے غلطی سے بیدل
کے اس رنگ کو منطبق کرنا چاہا مادی شاعری پر مادی تغزل پر اور ان واقعات حسن و عشق پر جو اس دنیا میں،
انسانی گوشت پوست سے متعلق رونما ہوتے ہیں، اس لئے جو کچھ اس نے لکھا وہ اُس کیف سے خالی رہا جو بیدل کے
پہاں پایا جاتا ہے اور چونکہ غالب کا ذوق شعری نہایت بلند تھا اس لئے وہ اس کی کو آخر کار خود بھی سمجھ گیا۔ بیدل
و غالب کے کلام کے اس فرق کو آپ ذیل کی مثال سے سمجھ سکیں گے
غالب کا مشہور شعر ہے:-

بساطِ عجز میں تھا ایک لکھ قطرہ خون بھی سو رہتا ہے باند از چکیدن سرنگون بھی

مفہوم یہ ہے کہ میری بساط عجز میں سوائے ایک دل کے کیا تھا سوائے اس کی بھی کیفیت یہ ہے کہ محض ایک قطرہ خون ہے جو ہر وقت ٹپک پڑنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ اس شعر میں قلب کی صنوبری ساخت اور اس کی تعلیق و اثر گوئی سے اس کا بہ صورت قطرہ آمادہ چکیدن رہنا ظاہر کیا ہے۔ یہ خیال غالب نے بیدل کے اس شعر سے لیا۔

آپ گریہ و خون یا قوت داریم بروئے خود چکیدن

لیکن فرق قابل غور ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ عالم خلق میں بہتر سے بہتر چیز کو لیلو مثلاً گوہر و یا قوت لیکن اسکا بھی یہ حال ہے کہ اس کا عجز اس کی حالت سے ظاہر ہے۔ داریم بروئے خود چکیدن۔ یہ پورا مصرعہ کیفیاتی تشبیہ سے متعلق ہے، غالب کے یہاں تشبیہ نظری و مادی ہے، اور دل کی تخصیص کر کے بساط عجز کے صفت ایک محدود و مخصوص منظر کو سامنے لاتا ہے، بیدل کوئی تعین نہیں کرتا بلکہ وہ تمام عالم وجود سے بحث کرتا ہے۔ غالب کو دل کی تخصیص کے ساتھ سرنگون اور یک قطرہ خون بڑھانا پڑا، بیدل کو اپنے مقصود کی وسعت کے لحاظ سے مطلق اسکی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ غالب کو اپنا مفہوم ذہن نشین کرانے کے لئے غیر معمولی تکلف کرنا پڑا، لیکن بیدل نے اسے زیادہ سادہ و مختصر الفاظ میں اور زیادہ قوت کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ فرق کیوں پیدا ہوا، صرف اس لئے کہ بیدل کا نظریہ شاعری غالب کے نظریہ شاعری سے زیادہ بلند ہے اور اس لئے جس مضمون کو بیدل نے اس قدر بلند ہو کر بیان کیا، غالب کو اس اظہار کے لئے نیچے آنا پڑا۔

اگر کسی وقت فرصت ہوئی تو میں کلام بیدل پر تفصیلی تنقید کرتے ہوئے اس مسئلہ کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کروں گا، فی الحال اسی پر قناعت کیجئے۔

کتابوں کی قیمت میں حیرت انگیز رعایت

جذبات بھاشا	۱۲	فرست البید	۱۲
شاعر کا انجام	۱۰	تذکرہ خندہ گل	۱۰
میران	۱۰	میران	۱۰
محصول	۱۰	محصول	۱۰

لیکن اگر آپ چار روپیہ آٹھ آنے کا منی آرڈر بھیج دیں تو ہم آپ کو یہ چاروں کتابیں ذریعہ رجسٹری بھیج دیں گے یہ رعایت صرف
اخیر مارچ تک قائم رہیگی۔

میران بنگار۔ لکھنؤ

محبت کا ایک لمحہ

شفق کے عنبرین شعلوں میں نغمہ گاتی تھا
نشاط اندوز ہو کر تیری گلزار میں آئی
ادھر سو سن کے لب سے بوسہ پہان چرائی
کبھی ہانگی کبھی ٹھہری کبھی حیران بھی کرنا
بہارِ شام کا بلبلوں نگین بھی گلابی تھا
فضا پر محویت سی اس کے قصہ ناز سے چھائی
ادھر اس کی سیابی پرہ چلی اور اترائی
کبھی اچھوٹکی مہمان کبھی اس پھول کی قرمان
اسے اک مستقل دیوانہ نکمت بنا ڈالا

دراستی بات کو افسانہ فطرت بنا ڈالا
سرحدیں دہ لب ہو گئی وہ ہستدر آخر
وہ سمجھی زندگی کو وقت نشا نوش ہو جانا
خیال میکشی میں جام کی صورت ہو ٹوٹا
کہان بے مضطرب قص کی ہنگامہ آرائی
کہان بے حق و شوق کی اب کار فرمائی
مثال برگ پر مردہ گری گل سے جدا ہو کر

تاشہ بنگلی ہر اک کا گلشن میں فنا ہو کر
بہارِ شام کے چنگاڑے جانکاہ کو دیکھا
ادھر سر و صوبہ کو ہوا اپنی جگہ سلکتا
دیکھا جاسکا ایسا تاملے تخرزا
کہ آگے اک جبارہ تھا شہیدِ حشر کا
کہ جسے جاویدی جبر سے کیف نکمت پر
ہوئی تکمیلِ لطف طرح رنگ تما کی
کہ جس بھی گئی باقی کچھ نہاں بیدار کی
وہ عیدِ اولین تھی عاشقِ حساس فطرت کی

نگاہ واپسین یہ مطلب گایہ محبت کی !!
نواغ سے گونج اٹھی فضا گلشن و صحرا
صدائے تمنا سے لگی ہر ساز سے پیدا
نغمہ آئین ہو گئی شبنم سے شامِ حشر تانی
تنوع ہو گیا پیدا حسن فطرت میں
سلاطین ہو گیا امواجِ دریا لطافت میں
کہ دیکھے اک شہیدِ آرزو کی صورتِ غربت

مگر فطرت نے فوراً صورتِ عالم بدل ڈالی
نشاط رنگ میں تاریکی ماتم بدل ڈالی
کجورون کے شجر گویا بنے اشجارِ نورانی
زمین پر چاندنی ہر نخل پر زکینیاں چھائیں
گہر شبنم نے برائے صدا آسا ہوا گلشن
خمارِ نوم سا چھانے لگا اربابِ فطرت پر
جسے دیکھا وہ آسودہ نظر آیا تلاطم میں
خوشی کی طرح پوشیدہ اسرارِ تکلم میں!

کہان گل کہان وہ میترے بتان فطرت میں
فضا، مسرور لہفت تھی، صبا معزور نکمت تھی
جگر میں جوشِ حشر کا تول میں سخت حیرانی
کوئی مسحور رنگ، کوئی صرا داد کوئی
بلا کی جاذبیت تھی کسی حساس فطرت میں
مگر بھر دی گئی تھین بھلیاں جامِ لطافت میں!

نیا عشق میں احساس کی نگیناں قائم
دوابع ہوش میں کیفیتِ روشن سکون افزا
خیال وصل یعنی التجائے مرگ خاموشی
غرض دل مستیوں میں نہاں زندگی
بہارِ حسن خلق آرا میں بے پروائی قائم
فراقِ حسن میں پہان چھلے جنون افزا
ملاں سحر یعنی تہائے دردِ جانسوزی
فنائے عشق کو ہوتی نہیں کچھ فکر حاصل کی
محبت کا ہر اک جلوہ جوابِ حسن فطرت ہے
یہی وہ پھول ہے حسین لطافت ہی لطافت ہے

حافظ غازی پوری

پیام

جز ”سعی دوام“ اور کیا ہے شاعر کا پیام اور کیا ہے
یعنی اس سیکدے کی رونق جز ”گردش جام“ اور کیا ہے
انسان کا کام اور کیا ہے

بہتے ہوئے آب زندگی پر کچھ نقش اثر بنائے جانا
ٹپتے ہوئے داغ آرزو کو چمکا کے قمر بنائے جانا
قطر و ن کو گہر بنائے جانا

کوشش میں ہے راز نظم ہستی جنبش ہے دلیل زندگانی
اسے ننگ وجود آدمی زار پانی میں اگر نہ ہو روانی
پانی کو کہیگا کون پانی

ہنگامہ سوز و ساز کیوں ہو دل کو اگر آرزو نہ چھوڑے
ساحل کی ہوا بند ہی ہوئی ہے طوفان سے لڑ رہے ہیں بڑے
کھاتے ہیں موج کے چھیرے

فطرت کا ”سکون مضرب“ دیکھ ساری چیزیں چل رہی ہیں
بادل ہیں منتشر فضا میں موجیں کروٹ بدل رہی ہیں
سرگرم عمل ہیں چل رہی ہیں

سرگرم عمل ہوائے صحرا ”طوفان بکنار“ چل رہی ہے
محنت کش ماہ و سال دنیا بالیل و نہار“ چل رہی ہے
جو یائے قرار“ چل رہی ہے

ہستی کا نظام ہے ”تسلسل“ ”تکمیل“ میں زندگی نہیں ہے
منزل کا وجود ہے خیالی منزل کہیں شوق کی نہیں ہے
فطرت کبھی رُخ و کئی نہیں ہے

جمیل منظری کاظمی

وکتوریہ میموریل کلکتہ میں چند زندہ تصویریں دیکھ کر

حسین چہرون سے رنگین نقاب اٹھائے ہوئے!
 خرام نازیہ پستانہ لغز شون کا ہجوم!
 سیہ نقاب میں شاداب و نازنین چہرے
 گھیری زلفون کے سایہ میں عارضون کی بہار
 سیہ نقابوں میں روشن شفق منسا رخسار
 رخ صبح پہ گیسوے مشکبو کا ہجوم!
 فضا کے کل مشکین میں شعلہ گون چہرے!
 زبان حافظ و خیام میں تکلم ریز!
 بھلا جلی جنھیں صدیوں سے سرزمین عجم!
 ہر اک ادا عجبت کے رنگ سے سرمست!

نگاہ یاس کو اذین کلام دیتی جاؤ!
 مسافرانِ حنین کا سلام لیتی جاؤ!

اختر شیرانی

غزل افسرِ مروہوی

اے سیلِ اشکِ خون کو بھی ساتھ لے نکل
 سایہ کی آفتاب کے پہلو میں جا نہیں
 اُمید ہو کے یاس مگر عارضی نہ ہو
 کاش ان کو اعتماد نہ ہو میری چاہ پر
 ہم خاک ہو کے بھی نہ ہوئے مائلِ زمین
 جب اٹھ چکے تھے ارضِ سما کے حجاب سب
 اے اضطرابِ ہجر نہ کھو آبروئے عشق

آنکھوں میں کچھ تو زخمِ جگر کا نشان رہے
 یارب جب ان کا قرب ہوا ہم کہاں رہے
 جو چیز میرے دل میں رہے جاوداں رہے
 جی چاہتا ہے کشمکشِ امتحان رہے
 جب تک بھی رہ سکے طرفِ آسمان رہے
 تم میری چشمِ شوق سے کیونکر نہاں رہے
 تاحدِ اختیار سے آتشِ نہاں رہے

لکھی تھی یہ مہیبتِ آخرِ نصیب میں
 پیری کے دکھ اٹھانے کو افسرِ جوان رہے

غزل صغریٰ و دہیانوی

محل غبارِ راہ سے پیدا کرے کوئی
اب وقت ہے کہ تیری تمنا کرے کوئی
جب دل ہی دے نہ ساتھ تو پھر کیا کرے کوئی
کیا اے عتبہ دیدہ بینا کرے کوئی
مقصد یہ ہے نہ روز تقاضا کرے کوئی
ایسا نہ ہو کہ آپ کو رسوا کرے کوئی
کیا آرزوئے دولت دنیا کرے کوئی
کب تک شکایتِ غم دنیا کرے کوئی
کب تک تمیز دہرو کلیسا کرے کوئی
آخر کمانِ تلک اٹھین رسوا کرے کوئی
پھر اہتمام سا غر و مینا کرے کوئی
آئینہ بن کے آپ کو دیکھا کرے کوئی
کس آسے پہ عشق کا دعویٰ کرے کوئی

خود اپنے دردِ دل کا مداوا کرے کوئی
دار و رسن ہے آگ ہے زندان ہے تیغِ ہر
بجور ہو کے اُن کی غلامی قبول کی
مدہوش ہین کلیم بھی تابِ جمال سے
موقوف ہے جو اُن کی ملاقاتِ حشر پر
مایوس دل میں تابِ شکیب سقدِ کمان
زیرِ فلک نہیں کسی شے کو بھی قرار
آمین فروش سے غمِ الفت خرید لین
آک نئے حرم کی بنا ڈالئے یہاں
آر بڑا حُسن و عشق سے دنیا کو گھیر لین
ہمراہ پھر چمن میں وہ جنت فریب ہے
یہ دیکھنا نہیں جو سراپا نظر نہیں
افسانہ جمیل ابھی یاد ہے نظر

غزل شاقب جالندہری

دل ہمو بھول جائے ہم دل کو بھول جائیں
کیا چاہتی ہیں مجھ سے چھائی ہوئی گھٹائیں
ٹھکرائی جا چکی ہیں جو میری التجائیں
اٹھتے ہوئے بگولے چلتی ہوئی ہوائیں
اک کشمکش کی دنیا رکھتی ہیں التجائیں
آسے خیال دہر بجو گئے لگا نہیں

یہ چاہتی ہیں انکی بیگانہ دار ادائیں
تو بہ ضرور کی ہے لیکن یہ سوچتا ہوں
امیدِ زندگی کا تھین آخری سہارا
وحشی کو چھیڑتے ہیں وحشی کو چھیڑتی ہیں
مایوسیوں میں دُوبینِ ناکامیوں نے ابھیں
دل تنگ آ گیا ہے اب نامراد یوں سے

گم کردہ راہ شاقب ہم عمر بھر رہینگے
ہاں بخود می میں شاید منزل کو دیکھ جائیں

رباعیات

اللہ نے اعجاز یہ تم کو ہی دیا ناکام محبت کا بھرم کھو ہی دیا
کیا جائے کیوں مجھ کو سر محفل ناز تم ہنس ہی دیئے دیکھ کے مین وہی دیا

اے دکھنے ہوئے دل کے دکھانے والے روتے ہوئے کو بان رولانے والے
اتنا نہیں کرتے ہیں کسی کو بیتاب ہنستے ہوئے منہ پھیر کے جانے والے

اٹھ اٹھ کے جھکی نگاہ جانان کسی ہوتی تھی ابھرا بھر کے پنہان کسی
فوارہ خون کا حال سپنے میں نہ پوچھ دل پر چلتی رہی ہیں چھریاں کسی

اے دوست بتا ترا تکلم کیا ہے چشم کیا ہے ترا تیسم کیا ہے
اسوقت فضا ہے ایک سحر لرزان آگے ترے مجھ کو یہ تو ہم کیا ہے

ہاں درد جگر کو کچھ تو اچھا کر لیں ہاں سوز درون کو کچھ تو ٹھنڈا کر لیں
رو لیں ترانام لیکے شام ہجران دکھتے ہوئے دل کا کچھ مداوا کر لیں

فراق گور کھپوری

چھپ کر طیار ہے گنوارہ تمدن

مولانا نیاز فتحپوری کی وہ بے مثل تصنیف جس میں، تاریخِ ہندوستانی روایات، علمِ الاصنام اور اساطیر کی مدد سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی صرف عورت کی ممنون ہے۔ اس کا دیباچہ، مقدمہ اور تہمتہ بلحاظ زورِ انشاء و حسن بیان دیکھنے کی چیز ہے یہ کتاب حکومتِ نظام اور صوبہ متحدہ میں لائبریری کے لئے اور انعامی کتب میں منظور ہو چکی ہے قیمت علاوہ محصول اک دور پیسہ (علم) بیخبر نگار لکھنؤ

مولانا شرم حرم

شوق قدوائی

دکھن پنی جاسوئی

تذکرۃ الشعرا

دیوان ناسخ

کلیات مرمن

عینہ بغدادی ۷
 لکھنؤیہ ۳
 رتہ العین ۳
 محذرات ۷
 جویاے حق ۷
 لعبت چین ۷
 فارغ مفتوح ۷
 بابک خرمی ۷
 الفاسو ۱۲
 ایام عرب ۷
 نفیس و لبی ۷
 یوسف و یحییٰ ۷
 روال بغداد ۷
 مینا بازار ۷
 مقدس تازنین ۷
 روتہ الکبریٰ ۷
 فلپانا ۷
 شوقین ملکہ ۷
 منصور موہنا ۷
 حسن انجیلنا ۷
 ملک العزیز و جانا ۱۲
 فردوس بریں ۷
 حسن کا ڈاکو ۷
 دربار حرام پور ۱۰
 غیب دان دلسن ۷
 بدر النساکی صیت ۷

ترانہ شوق ۷
 قاسم و زہرہ ۱۲
 نیرنگ جمال ۲
 میرولی شربی ۷
 بندگی ۷
 کاس الکرام ۷
 لسان انیب جلد اول ۷
 دوم ۷
 سوم ۷
 چہارم ۷
 نگدان فصاحت ۷
 بادۃ ناب ۷
 ظفر عمر بی ۷
 چوروں کا کلب ۹
 نیلی چھتری ۷
 بہرام کی کوفتاری ۷
 مولانا نیاز فتح پوری ۷
 گیتان جلی ۷
 گوارۃ تمدن ۷
 نگارستان ۷
 صحابیات ۷
 تاریخ الدولتین ۷
 سید مجاہد بی ۷
 زہرا ۱۳
 جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲
 خیالستان ۷
 ثالثہ بخیر ۷

مرابغیش ۷
 بالشوک شہزادی ۷
 شہید وفا ۷
 ممتاز بیگم ۱۲
 شعلہ زگین ۷
 محاصرہ پیرس ۷
 شیخ چلی ۷
 بہادر ترک ۷
 بہرام کی واپسی ۷
 انقلاب فرانس ۷
 حسن بنارس ۷
 فطرتی جاسوس ۷
 ترکی حرم سرا ۷
 جنگ طرابلس ۷
 بہرام چور ۷
 زر پرست ۷
 کبھی کا باز ۷
 عبد الرحمن ناصر ۷
 عروس مصر ۷
 سیلاب خون ۷
 کرشمہ ۷
 وفادار دلسن ۷
 طواف زمین ۷
 نگار بکٹ اکھنسی ۷
 نظیر آباد و کھنؤ ۷

سماحت زمین ۷
 سماحت ہوا ۷
 نازنین مراکش ۷
 سمندر کی سیر ۷
 اسرار بالشونیم ۷
 روح لیلیٰ ۷
 امین بک ۷
 حجاج بن یوسف ۷
 یوسف پاخا ۷
 انقلاب عثمانی ۷
 بہرام کی رہائی ۷
 بہرام کی آزادی ۱۲
 بہرام کی سرگزشت ۷
 لال کھنؤ ۷
 براسرار قتل ۷
 ادبی کتابیں ۷
 مکمل شرح دیوان غالب ۷
 بزم خیال ۷
 مشاطہ سخن ۷
 انشاء سنواں ۶
 مکاتیب حسن الملک ۷
 لیلیٰ مجنوں ڈراما ۷
 مرانی ۷
 مرانی دبیر ۷
 مرانی انیس ۷
 مرانی ضمیر ۷

تذکرہ حمینی ۱۱
 گلشن ۱۰
 سراپاے سخن ۷
 سماع نظیر اکبر آبادی ۷
 دیوان شمس تبریزی ۱۲
 کلیات عراقی ۱۲
 دیوان حافظ ۷
 دیوان نعمت خان عالی ۷
 کلیات افوری ۷
 دیوان بے دل ۱۰
 کلیات سعدی ۷
 دیوان عرفی ۱۲
 کلیات جامی ۷
 کلیات غالب ۷
 کلیات صائب ۱۲
 کلیات خرمی ۱۲
 دیوان عنصری ۱۲
 دیوان ظہیر فاریابی ۶
 دیوان غنی کشمیری ۶
 دیوان ناصر علی ۶
 دیوان ہلالی ۶
 کلیات جلال سیر ۷
 دیوان حسن دہلوی ۷
 کلیات ظفر ۱۲

کلیات میر ۷
 کلیات سودا ۷
 کلیات انشا ۷
 کلیات نظیر اکبر آبادی ۷
 گلزار داغ ۷
 دیوان رند ۹
 دیوان ذوق ۱۲
 کلیات اسمعیل ۷
 مرآۃ الغیب ۷
 صحنیۃ عشق ۷
 فریاد داغ ۷
 دیوان قاتل ۷
 دیوان شہیدی ۷
 عجائب غرائب ۷
 عجائب الخلق و القادریہ ۷
 باقصویر سادہ ۷
 مجمع الفنون ۷
 طلسم فرنگ ۷
 کارخانہ عالم ۷
 زائد زکات و دوسرے قریب ۷
 اردین دیلی ۷
 فریب حسن ۷
 سوزن عشق ۷
 روزالمیرٹ ۷
 نادں اسرار ۷
 شام جوانی ۷
 طلسمی فانوس ۷

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا دودھ ایم فیض افسانہ جو اردو زبان میں بالکل نئی مرتبہ تحلیل نقیاتی کے ہول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تحلیل کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر محال کے درجہ تک پہنچتی ہے قیمت علاوہ محصول ڈاک ایک روپیہ (۷۵)

صحابیات

جس میں عہد سعادت کی ۵۸ خواتین کے مستند حالات کیجا کر دیئے گئے ہیں۔ اس کا مقدمہ لانا نیا نئے خاص پن انشامیں اس قدر جوش و قوت کے ساتھ لکھا ہے کہ سانسائیت کے بہت سے نکات اس سے حل ہو جاتے ہیں قیمت علاوہ محصول ۸۰

شاعر کا انجم

جناب نیاز کے عقوان شہاب کا لکھا ہوا افسانہ جس میں پاکیزگی بیان، اسلوب و انداز، ندرت خیال اور عبت اظہار کے لیے نادر نمونے موجود ہیں کہ کسی ادبی تصنیف میں مل سکتے۔ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کا ایک ایک جگہ میں موجود ہیں۔ قیمت علاوہ محصول دس آنے ۱۰

فرست الید

مولفہ نیاز فچوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی با تھ کی شناخت اور اس کی گہروں کو دیکھ کر اپنے یاد دہرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح طور پر پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۷۵

سارخ الدوین

جرجی زریان مصر کے مشہور مورخ کی تاریخ تہذیب اسلامی کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔ تہذیب و تمدن عباسی کی سیاسی تاریخ پر بہت روشنی ڈالتا ہے۔ ترجمہ مولانا نیاز نے کیا ہے اور اس قدر سادگی و سادگی کے ساتھ کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ قیمت علاوہ محصول ۷۵

جذبات بھاشا

ہندی شاعری کی جلالت و شیرینی تمام دنیا کی شاعری میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے جناب نیاز نے ایک لچک پتید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی انگریزی و تشریح کی ہے کہ دل جیاب ہو جاتا ہے قیمت علاوہ محصول بارہ آنے (۱۲)

مذکرہ خندہ گل

مولفہ مولیٰ عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ سے زائد اردو قلمی کے ظریف غرض و اختیارات مع ان کے لطائف و ظرافت اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی ہیں۔ قیمت ۵۰ صفحات۔ قیمت مع محصول چار روپیہ (۴۰)

گوارہ تمدن

(دوسرا ایڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکہ الار کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ اہل تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا سے تہذیب و شایستگی اس کی کس قدر محنتوں ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۷۵

نگارستان

(دوسرا ایڈیشن) زیر طبع ہے جس میں حضرت نیاز کے اور متعدد ادبی مضامین اور افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس میں منقول کیے گئے۔ اس کے متعدد مضامین غیر زلفون رحمت بعد طباعت یقین کیا جائیگی۔

(مطبوعہ نگارستان پریس پکٹ آف کھنڈ با تمام نیاز فچوری)